جس میں فہم قرآن سے متعلق تمام قدیم و جدید نظریوں پر مبسوط اور محققانہ بحث کی گئی ہے اور قرآن مجید کے آسان ہونے کی حقیقت کو دل نشین پیرایہ میں واضح کیا گیا ہے، نیز بتایا گیا ہے کہ وحی الٰہی اور کلام ربانی کا صحیح اور قطعی منشاء معلوم کرنے کے لئے صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور اقوال و اعمال کا معلوم کرنا کیوں ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں تدوین حدیث اور اس سے متعلقہ مضامین فتنہ وضع حدیث، اس فتنہ کی روک تھام، حدیث کے پایہ اعتبار، صحابہ کی عدالت کثرت سے روایت کرنے والے بعض صحابہ کے حالات، دور تابعین کی خصوصیات اور دیگر اہم عنوانات پر تفصیل سے کلام کیا گیا ہے۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی (ایم اے فاضل دیوبند)

رفیق ندوۃ المصنفین و مدیر اعلیٰ ماہنامہ "برہان" دہلی

لاہور — کراچی

جس میں فہمِ قرآن سے متعلق تمام قدیم وجدید نظریوں پر مبسوط اور محققانہ بحث کی گئی ہے اور قرآن مجید کے آسان ہونے کی حقیقت کو دل نشین پیرایہ میں واضح کیا گیا ہے، نیز بتایا گیا ہے کہ وحیِ الٰہی اور کلامِ ربانی کا صحیح اور قطعی منشا معلوم کرنے کے لیے صاحبِ شریعت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور اقوال و اعمال کا معلوم کرنا کیوں ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں تدوینِ حدیث اور اس سے متعلقہ مضامین فتنۂ وضعِ حدیث، اس فتنہ کی روک تھام، حدیث کے پایۂ اعتبار، صحابہ کی عدالت کثرت سے روایت کرنے والے بعض صحابہ کے حالات، دورِ تابعین کی خصوصیات اور دیگر اہم عنوانات پر تفصیل سے کلام کیا گیا ہے

پہلی بار عکسی طباعت : جنوری ۱۹۸۲ء

باہتمام : اشرف برادران سلمہم الرحمٰن

ناشر : ادارہ اسلامیات لاہور

طباعت : وفاق پریس لاہور

قیمت مجلد ڈالی دار :
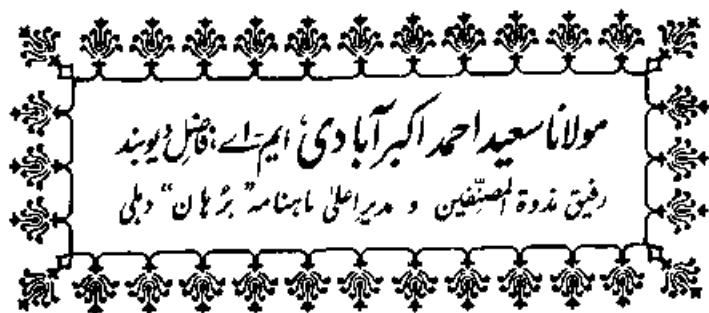
ادارہ اسلامیات

پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

★ — دینا ناتھ مینشن، مال روڈ، لاہور
فون ۷۲۴۳۴۱۲، ۷۲۴۳۷۸۵ فیکس ۹۲-۴۲-۷۲۴۳۷۸۵

★ — ۱۹۰ انارکلی، لاہور، پاکستان
فون — ۷۲۳۳۹۹۱ - ۷۳۵۲۱۵۵

★ — موہن روڈ
چوک اردو بازار، کراچی فون ۷۷۲۲۴۰۱

ملنے کے پتے

- ادارہ اسلامیات ۱۹۰ - انار کلی لاہور
- دارالاشاعت اُردو بازار کراچی نمبر ۱
- ادارۃ المعارف دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴
- مکتبہ دارالعلوم - دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴

فہم قرآن

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچۂ طبعِ ثانی

"فہمِ قرآن" پہلی مرتبہ سنہ ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی تھی اور اس کو مطبوعاتِ ندوۃ المصنفین کے دوسرے سیٹ میں شامل کر کے محسنین و معاونینِ ادارہ کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ اب تقریباً پانچ سال کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن زیادہ بہتر اور زیادہ مکمل صورت میں شائع ہو رہا ہے۔

مضامین کی ترتیب وغیرہ کے لحاظ سے طبعِ اول میں جو نقائص رہ گئے تھے اس دفعہ ان کو بڑی حد تک دور کر دیا گیا ہے اور بہت سے اہم اور مفید اضافے بھی کئے گئے ہیں، اسلوبِ بیان بھی کچھ سے کچھ ہو گیا ہے۔

وقت کے جدید مسائل پر ندوۃ المصنفین نے جو کتابیں شائع کی ہیں، ان میں "فہمِ قرآن" ایک خاص رنگ کی تبلیغی اور اصلاحی کتاب ہے۔ پھر اس کی اہمیت اس وجہ سے اور بھی بڑھ گئی ہے کہ موضوعِ کتاب کا تعلق ایک ایسے مسئلہ سے ہے جو آج کل خاص طور پر ہمارے بہت سے جدید تعلیم یافتہ اصحاب کی بحث و نظر اور غور و فکر کا مرکز بنا ہوا ہے۔

فہمِ قرآن اور تدوینِ احادیث کے متعلق جو مختلف نکتے یا مختلف قسم کی جو

الجھنیں ان حضرات کے دماغ میں ہیں وہ ان کا تشفی بخش اور دل پذیر حل دریافت کرنا چاہتے ہیں. زیر نظر کتاب اسی ضرورت کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے. اور اس مرحلے پر بے تکلف یہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ "فہم قرآن" اس سلسلہ کی پہلی مستند اور جامع باشان تالیف ہے جس میں اس مسئلہ کے تمام اہم اور ضروری گوشوں پر وقت کے جدید تقاضوں کی روشنی میں مفصل کلام کیا گیا ہے۔

دعا ہے حق تعالیٰ مصنف کی کاوش وسعی مشکور فرمائے اور طالبانِ حق اس سے زیادہ سے زیادہ نفع اٹھائیں۔

عتیق الرحمٰن عثمانی

ناظم ندوۃ المصنفین دہلی

[illegible]؍ رمضان المبارک [illegible]ھ

مطابق [illegible]؍ اگست [illegible]ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جس طرح کسی شخص کے اعضاء رئیسہ میں فتور پیدا ہو جاتا ہے تو اس سے تمام جسم متاثر ہوتا ہے معدہ و جگر بیمار ہوتے ہیں تو مریض کا مزاج، عادات و خصائل، چہرہ کا رنگ، جسم کی موزونیت یہ سب چیزیں بدل جاتی ہیں، دماغ کا توازن خراب اور طبیعت میں ایک خاص قسم کا چڑچڑا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ ٹھیک یہی حال قوموں اور جماعتوں کا ہے۔ کسی قوم کے اربابِ علم و فضل اس قوم کے لئے قلب و جگر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پس ظاہر ہے اگر یہ تندرست اور قوی ہیں تو قوم کے افراد میں بھی صحت و تندرستی کے آثار پائے جائیں گے، لیکن اگر بدنصیبی سے ان لوگوں کا ہی حال سقیم ہے، خود ان ہی کے دماغ کا توازن بگڑ گیا ہے اور ان میں آپس میں یکجہتی و ہم خیالی، ہم مقصدی و ہم آہنگی نہیں ہے تو پھر غریب افراد کا پوچھنا ہی کیا، وہ اگر ریگ کے ذروں کی طرح منتشر و پریشان ہوں تو تعجب نہیں، اور اگر ان کا "خاکسترِ قومیت" دوشِ ہوا پر جہالت و نادانی کے تیرہ و تار بیابانوں میں آوارہ پھر رہا ہے تو اس پر کوئی حیرت نہیں۔

آہ! کیونکر کہیے کہ آج مسلمانوں کی قوم کا حال بھی یہی ہے۔ جماعت جس جذبے سے جماعت بنتی ہے یعنی احساسِ مرکزیت وہ سرا سر ان میں مفقود ہے، ہر شخص ایک نئے خیال کا پابند اور ہر فرد ایک نئے جذبہ و آہنگ سے ہمکنار ہے۔ ایک مرض ہو تو اس کی شکایت کی جائے، زخم ایک ہو تو

اس کے لئے تدبیر چارہ گری کی جا سکتی ہے، جب جسم "ہمہ تن داغ" بن گیا ہو تو پنبہ و مرہم کہاں کہاں رکھا جائے۔ دامان و جیب اگر کہیں سے پھٹ گئے ہیں تو انھیں سیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر دستِ وحشت نے ان کو تار تار کر دیا ہے تو پھر کیوں کسی کا احسانِ سوزن کاری و منتِ بخیہ گری اٹھایئے کہ یہ سب تدبیریں اور چارہ سازیاں لاکھ کوششوں کے بعد بھی مفید ثابت نہیں ہو سکتیں۔

مرکز کی اہمیت | ہر جماعت کی روحِ رواں اس کا مرکز ہوتا ہے جب تک اس قوم کے افراد میں مرکز سے وابستگی پائی جائے گی ان کی روح سرسبز و شاداب رہے گی اور جتنا جتنا اس وابستگی میں اضمحلال پیدا ہوتا جائے گا ان کی قومیت بھی مضمحل، کمزور اور انحطاط پذیر ہوتی رہے گی یہاں تک کہ اگر یہ احساسِ مرکزیت بالکل نابید ہو جائے تو پھر وہ جماعت جماعت نہیں رہتی اس کے افراد ٹوٹی ہوئی تسبیح کے دانوں کی طرح منتشر اور "گریبانِ عاشق" کی مانند پراگندہ و متفرق ہو جاتے ہیں۔ ان میں ہر ایک کی دنیا الگ، ہر ایک کا مرکزِ خیال جدا، اور ہر ایک کا کعبۂ مقصود نیا ہوتا ہے، ان میں جماعتی وحدت مفقود ہو جاتی ہے اور انفرادی تشتتِ خیال، ان کے نظامِ جماعت کے شیرازہ کو پریشان کر کے رکھ دیتا ہے۔

مسلمانوں کا مرکز | مسلمانوں کا مرکز کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں ایک اور صرف ایک ہے اور وہ قرآن ہے، ان کے تمام عبادات، معاملات، معاشرت، تمدن، تہذیب اور ان کے تمام اجتماعی اور اقتصادی نظام سب اسی ایک مرکز سے وابستہ اور اسی ایک رشتے سے منسلک ہیں۔ ان کی تمام اخلاقی و روحانی برتریوں اور برتریوں کا دارومدار صرف اسی ایک کتابِ مبین سے تعامل پر ہے انھوں نے اس کی قیادت میں جب کبھی کسی جانب رُخ کیا دشمنوں کی صفیں پہاڑ کی طرح مضبوط تھیں، دم کے دم میں الٹ گئیں اور کفر و شرک کے مضبوط قلعے مفتوح و سرنگوں ہو کر حق و صداقت کا پرچم اڑانے لگے۔ انھوں نے قرآن کی مشعل کو ہاتھ میں لئے ہوئے جس کسی وادیٔ پُرظلمت کی جانب اپنے گھوڑوں کی باگیں موڑیں تردد و تذبذب اور شک و شبہ کی تاریکیاں خود بخود چھٹتی چلی گئیں اور پھر وہاں ایمان و ایقان کے آفتابِ جہانتاب نے

اس شان سے طلوع کیا کہ ع

عالم تمام مطلعِ انوار ہوگیا

لیکن جب سے دنیا کے جھیلوں میں پڑکر ان کو قرآن حکیم سے بُعد ہونا شروع ہوا ان کی روحِ قومیت بھی درماندہ ہونے لگی اور آج اس کے جو نتائج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں ان کے ماتم میں دیدۂ و دل سے جتنا بھی دجلۂ خون بہے کم ہے اور جس قدر بھی آہ و فغاں کے شرارے لب و دہن سے بلند ہوں تھوڑے ہیں۔

قرآن پر عمل سے انحراف اور روگردانی کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ ہمارے زمانہ میں بعض انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب نے فہمِ قرآن سے متعلق ایک عام غلط فہمی یہ پھیلا دی ہے کہ قرآن وید کی طرح کوئی ایسی کتاب نہیں جس کا علم کسی خاص طبقہ تک محدود ہو۔ بلکہ وہ ایک آسان کتاب ہے اس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ آج ہر شخص اپنی بساطِ علمی اور استعدادِ فکری کے مطابق قرآن کی کسی آیت کے جو معانی چاہتا ہے متعین کر لیتا ہے اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دینے لگتا ہے۔

اس بنا پر اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ان دونوں مسئلوں کی تنقیح کرکے یہ صاف صاف بتا دیا جائے کہ

(۱) کیا قرآن آسان ہے؟ اور اگر ہے تو اس کی حقیقت کیا ہے؟ کیا وہ عربی کی معمولی شُد بُد سے سمجھ میں آسکتا ہے اور ہر شخص کو اس سے استخراجِ احکام و استنباطِ مسائل کا حق حاصل ہوسکتا ہے

(۲) اور اگر قرآن کے فہم کے لیے صرف عربی کی معمولی استعداد کافی نہیں ہے تو اب یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ اور کونسے شرائط ہیں جن کی تکمیل کے بغیر کسی شخص کو فہمِ قرآن کا ادعا جائز نہیں

اس وقت آپ کے ہاتھوں میں جو کتاب ہے اس کا موضوع انھیں دونوں مسئلوں پر بحث کرنا ہے۔

کلمۃ حقٍ اُرِیدَ بِہِ البَاطِلُ | جیسا کہ آگے چل کر ہم بتائیں گے قرآن واقعی آسان ہے۔ لیکن اس کی حقیقت وہ نہیں ہے جو آج کل کا ہمارا ایک مخصوص طبقہ سمجھتا ہے۔ ان حضرات کے نزدیک تو قرآن کے آسان ہونے کے معنی یہ ہیں کہ

(۱) قرآن کو سمجھنے کے لئے کسی خاص علم و فن کا حاصل کرنا ضروری نہیں۔

(۲) قرآن سے احکام کا استنباط جس طرح حضرت عبد اللہ بن عمرؓ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ اور حضرت ابنِ مسعودؓ کرسکتے تھے ہم بھی کر سکتے ہیں اور ہم میں اور دوسرے ائمۂ تفسیر میں کوئی فرق نہیں ہے۔

(۳) اب تک جو تفاسیر لکھی گئی ہیں بیکار ہیں، کیونکہ قرآن تو ایک آسان کتاب ہے، اس کے فہم کے لئے کسی معلم اور راہنما کی ضرورت ہی نہیں۔ ہر شخص ترجمہ دیکھکر اس کا مطلب خود بخود معلوم کر سکتا ہے۔

پھر ان ہی لوگوں میں اب ایک گروہ پیدا ہوا ہے جو ایک قدم اور آگے بڑھ کر کہتا ہے:۔

(۴) فہم قرآن کے لئے حدیث کی بھی ضرورت نہیں۔ قرآن ایک مکمل سرچشمۂ ہدایت ہے اسلامی احکام کی تمام کلیات و جزئیات اس میں بیان کردی گئی ہیں، ان کے ہوتے ہوئے کیا ضرورت ہے کہ احادیث کی روشنی میں قرآن مجید سے احکام مستنبط کئے جائیں۔

ان حضرات کا دعویٰ اور اس پر ان نتائج کی بنیاد کو دیکھکر ہم حضرت علیؓ کے قول کے مطابق یہی کہہ سکتے ہیں کہ۔

کلمۃ حق اُرید بہا الباطل — بات تو حق ہے لیکن ارادہ باطل چیز کا کیا گیا ہے۔

ادعائے باطل کا اصل سبب

لیکن اصل مسئلہ پر گفتگو کرنے سے پہلے اس امر پر متنبہ کردینا ضروری ہے کہ آپ نے کبھی اس پر غور فرمایا ہے کہ جو بات ساڑھے تیرہ سو برس میں آج تک نہیں کہی گئی وہ آج کیوں کہی جارہی ہے۔ مسلمانوں کے دورِ عروج وارتقاء سے لیکر اب تک ہر زمانہ میں برابر یہ دستور رہا کہ جو حضرات فہمِ قرآن کی سعادت حاصل کرنے کے لئے عمریں صرف کرتے تھے ملک ملک کی خاک چھانتے تھے، علوم قرآن میں ہی اشتغال رکھتے تھے لوگ ان کو ہی قرآن کے معانی و مضامین پر کلام کرنے کا اہل سمجھتے تھے اور جب بھی کوئی ایسا معاملہ پیش آتا تھا تو انھیں حضرات کی طرف رجوع کیا جاتا تھا یہ کبھی نہیں ہوا کہ ہر شخص کو خواہ وہ قرآن سے اشتغال رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو فہم قرآن کے

شرائط کا جامع ہو یا نہ ہو۔ بہرحال قرآن مجید کے آسان ہونے کے باعث اس کو قرآن کے حقائق و مطالب پر خودسرانہ طور سے کلام کرنے کا اہل سمجھا گیا ہو۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ جو دعویٰ پہلے کبھی نہیں کیا گیا وہ آج کیا جارہا ہے اور جس چیز کو پہلے کبھی زبان پر نہیں لایا گیا آج برملا اس کی اشاعت کی جارہی ہے

اصل یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد جب انگریزوں نے ہندوستان پر اپنے حاکمانہ قبضہ کی گرفت مضبوط کرنی چاہی تو انھیں یہ محسوس ہوا کہ ہندوستان کی قومیں اور بالخصوص مسلمان کٹر قسم کے مذہبی لوگ ہیں اور اپنے مذہبی تعصب کی بنا پر انگریزوں کی ہر ایک چیز سے نفرت شدید کرتے ہیں اور اسی مذہبی جوش کے باعث ان میں جذبۂ جہاد (. Fanaticism) بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ انگریز ہندوستان کو فتح کر چکے تھے لیکن وہ جانتے تھے کہ مسلمان کا جذبۂ جہاد ایک شیر کی طرح ہے کہ جب تک وہ اپنی کچھار میں پڑا سوتا رہتا ہے کسی چیز کی پروا نہیں کرتا لیکن جب وہ بیدار ہو جاتا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت بھی اس کو خوف زدہ نہیں کر سکتی یہی اندیشہ تھا جس نے انگریز کو پریشان کر رکھا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ کوئی ترکیب ایسی چلنی چاہیے کہ مسلمانوں کے دلوں میں انگریزیت کے خلاف جو جذبۂ نفرت بھرا ہوا ہے وہ جاتا رہے۔ لیکن اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ مسلمان علمائے کرام کے زیر اثر تھے اور وہ کسی حالت میں بھی انگریز کی طہارت کا فتویٰ دینے کے لئے تیار نہ تھے۔ اب انھیں محسوس ہوا کہ ان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ علمائے کرام کا ہی وجود ہے، اور یہ ایسی کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہیں ہیں کہ آسانی سے کسی کے نقرئی یا زریں دامِ فریب میں آسکیں۔ اس بنا پر انھوں نے چاہا کہ کسی طرح علماء کا وقار ختم کر دیا جائے، اور مسلمانوں کے دل و دماغ پر انھوں نے جو تسلط جما رکھا ہے اس کی گرفت کو ڈھیلا کر دیا جائے۔

یہ اس فکر میں تھے ہی کہ انھیں سرسید اور ان کے بعض ہم خیال لوگ مل گئے جنھوں نے "تہذیب الاخلاق" کے نام سے ایک رسالہ نکالنا شروع کیا اور اس میں اپنے مذہبی مضامین کے ذریعہ غریب علماء کا تو ذکر ہی کیا ہے، سرے سے مذہب کی بساط ہی الٹ کر رکھ دی، آپ

آپ سرسیّد کے مضامین پڑھیے، ان کے ہم خیال شعراء کی نظمیں دیکھئے، آپ محسوس کریں گے کہ ان میں کس آزادی کے ساتھ علماء کرام پر آوازے کسے گئے ہیں، کیسی کیسی نادر اور نرالی پھبتیاں ان پر چست کی گئی ہیں۔ ان لوگوں کو یقین تھا کہ محض سب وشتم سے کام نہیں چلتا۔ اس لئے علماء کے وقار کو ختم کرنے کے لئے انھوں نے ایک اور تدبیر اختیار کی جو شاید پہلی سے زیادہ کامیاب رہی، ایک طرف تو انھوں نے کہنا شروع کیا کہ اَلدِّیْنُ یُسْرٌ "دین تو آسان ہے۔ ہر شخص اس کو اپنی اپنی سہولت و آسانی کے مطابق سمجھ سکتا اور اس پر عمل کر سکتا ہے اور دوسری طرف انھوں نے کہا کہ حضور خود فرما گئے ہیں انتم اعلم بامور دنیاکم "تم اپنی دنیا کی باتوں کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو" پھر کبھی انھوں نے اعلان کیا کہ دین سے ایسا کونسا پیچیدہ معمہ جس کے حل کرنے کے لئے ابو حنیفہؒ یا کسی غزالیؒ ورازیؒ کا دماغ وجانسوزی درکار ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود فرما گئے ہیں مَنْ قَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دَخَلَ الْجَنَّۃَ جس کسی نے لا الٰہ الا اللہ کہہ لیا جنت میں داخل ہو گیا۔

یہ جتنی باتیں کہی گئیں، الفاظ کی حد تک سب درست تھیں لیکن ان الفاظ کے قالب پر معانی کا جو جامہ چڑھایا گیا، اسلامی تخیل کے نقش سے بالکل معرّا اور سادہ تھا اور اس پر جگہ جگہ اغراضِ فاسدہ کے سیاہ دھبے پڑے ہوئے تھے، اس طرح کی باتیں کہہ کہہ کر مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ دین اور قرآن کوئی مشکل چیز نہیں ہے۔ ہر شخص خواہ عربی کا عالم ہو یا نہ ہو اُسے سمجھ سکتا ہے اور اس کے احکام معلوم کر سکتا ہے۔ اس لئے علماء کا جو وصفِ مابہ الامتیاز سمجھا جاتا ہے وہ ایک بے بنیاد چیز ہے۔ انگریز اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا اور آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو علماءِ اسلام کی ایک جماعتِ حقہ سے نفرت دلا کر کس اطمینانِ خاطر کے ساتھ ہندوستان پر حکومت کر رہا ہے۔

دراصل یہ ہے تاریخ اس طرح کے پروپیگنڈے کی اور یہ جو کچھ کہا جا رہا ہے کوئی نئی بات نہیں، بلکہ ایک نوائے قدیم کی صدائے بازگشت ہے جو کچھ دنوں کے لئے خاموش ہو گئی تھی مگر اب بعض مصالح کی خاطر سیاست کے حُدی خواں نے پھر اس نغمۂ کارواں کو گانا شروع کر دیا ہے۔

اب آئیے اصل مسئلہ کی تحقیق کریں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ معلوم کرلینا چاہیے کہ قرآن آسان ہے یا نہیں اگر آسان ہے تو اس کی حقیقت اور اس سے مراد کیا ہے؟

قرآن کے آسان ہونے کا مطلب

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن نے اپنے تئیں خود آسان کہا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ۔ (القمر)

اور تحقیق ہم نے قرآن مجید کو سہل کر دیا تاکہ لوگ اس سے نصیحت حاصل کریں تو کیا کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا!

یہ آیت، سورۃ القمر میں متعدد بار آئی ہے۔ سورۃ کے شروع میں قیامت کا ذکر ہے اور ان لوگوں پر شدید نفرت کا اظہار کیا گیا ہے جو اپنی خواہشات کی پیروی میں دن رات مشغول رہتے ہیں اور داعی حق کی آواز کو بالکل نہیں سنتے۔ پھر علی الترتیب، قوم نوح، عاد، ثمود اور قوم لوط کی نافرمانی و سرکشی اور قہر الٰہی سے ان کے تباہ و برباد ہوجانے کا بیان الگ الگ ایسے انداز میں کیا گیا ہے جس کو سن کر سخت سے سخت منکر کا بھی دل لرز جائے اور ہر واقعہ کے ذکر کے بعد بطور تنبیہ دریافت کیا گیا ہے۔

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ (القمر)

(دیکھو میرا عذاب دینا اور ڈرانا ان کے حق میں) کس طرح ہوا؟ پس کیا کوئی ہے (اس سے) نصیحت حاصل کرنے والا!

اور مذکورہ بالا آیت میں نصیحت حاصل کرنے کے لئے قرآن کی آسانی اور سہولت کو بیان فرما کر اس سے سبق لینے کی دعوت دی گئی ہے۔

ایک اور موقع پر سورہ مریم میں ارشاد ہے۔

فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ وَتُنْذِرَ بِهِ قَوْمًا لُدًّا۔

اور تحقیق ہم نے قرآن مجید کو تمہاری زبان میں آسان کر دیا ہے تاکہ تم اس کے ذریعہ پرہیزگاروں کو بشارت سناؤ اور جھگڑالو قوموں کو ڈراؤ دھمکاؤ۔

(سورۂ مریم)

قرآن ہدایت و نصیحت کی کتاب ہے

لیکن ان دونوں آیتوں کے نفسِ مطلب اور ان کے سیاق و سباق پر غور کیجئے تو یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید کی زبان میں اس کے آسان ہونے کے کیا معنی ہیں؟ پہلی آیت کا سباق اور اس کا ماقبل سے ربط آپ کو معلوم ہو چکا، اس سے صاف طور پر یہی متبادر ہوتا ہے کہ قرآن مجید رشد و ہدایت کی آسان کتاب ہے، اس میں عبرت و بصیرت کے لیے جگہ جگہ اقوامِ کہن کے واقعات کا بیان ہے اور خدا کے وجودِ حق کو ثابت کرنے کے لیے قدرت کی ایسی واضح نشانیاں بتائی گئی ہیں جن کا ایک ایک ذرہ مبدأ فیاض کے وجود و ثبوت اور اس کی قدرت بے مثال کا زبانِ حال سے اعلان کر رہا ہے، یہ سب باتیں ان کو قرآن مجید سے ہی معلوم ہوتی ہیں اس لیے اس عالمِ کون و فساد میں ہدایت کا سرچشمہ قرآن مجید ہی ہوا تو کیا پھر کوئی ہے جو اس سے موعظت گیر ہو اور نصیحت حاصل کرے؟

پانی کا برسنا، برق کی چمک، رعد کی گرج، دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن کا آنا آفتاب کا مشرق سے طلوع کرنا اور مغرب میں غروب ہو جانا، موسموں کا تغیر و تبدل، انسان کا عدم سے وجود میں آنے کے لئے کن کن مراحل سے گذرنا، چشموں کا اُبلنا، کھیتوں کا سرسبز و شاداب ہونا پتھروں سے پانی کا پھوٹ کر نکلنا اور اونٹ کی عجیب و غریب خلقت اور اسی طرح کی وہ سیکڑوں نشانیاں جو قرآن مجید میں مذکور ہیں ایک انسان بار بار ان کو دیکھتا ہے لیکن اس کا ذہن ان کے صانع خالق کی طرف منتقل نہیں ہوتا قرآن حکیم انتہائی فصیح و بلیغ پیرایۂ بیان میں ان کا ذکر کرتا ہے، اور لوگوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ ان سب چیزوں کے اصل منشا اور باعث اور ان کی علت فاعلہ پر غور کریں۔ ظاہر ہے یہ چیزیں مشاہدات سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کا دیکھنا، سمجھنا ان سے خدا کے وجود پر استدلال کرنا، چنداں مشکل و دشوار نہیں، ضرورت صرف اس کی ہے کہ آدمی اس کی طرف متوجہ ہو۔ پس اسی بنا پر قرآن مجید نے اپنے تئیں آسان کہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ یسر القرآن کا ذکر کر کے للذکر یعنی نصیحت کے لئے، فرمایا گیا ہے، اور پھر ارشاد ہوا فھل من مدکر؟

سورۂ القمر کی آیت کے علاوہ سورۂ مریم کی جو آیت اوپر مذکور ہوئی ہے اس کا مطلب بھی یہی ہے، چنانچہ فرمایا گیا ہے۔

لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَ — ہم نے قرآن کو اس لئے آسان کیا ہے کہ آپ اس کے ذریعہ پرہیزگاروں

تُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا (مریم) — کو خوشخبری کا سنائیں اور جھگڑالو لوگوں کو ڈرائیں۔

مقصد یہ ہے کہ قرآن مجید میں ترغیب و ترہیب سے متعلق جو باتیں بیان کی گئی ہیں وہ اس قدر صاف واضح اور روشن ہیں کہ وہ لوگ جن کے دل میں عناد و تعصب کے شعلے نہیں بھڑک رہے ہیں، ان کو سن کر شاد کام فلاح ہو جائیں گے اور جو فرطِ عداوت سے انکار و جحود کی قسم کھا بیٹھے ہیں ان کو قرآن کی آیاتِ وعید سن کر تنبّہ ہوگا اور وہ سمجھیں گے کہ جو قادرِ مطلق عاد و ثمود کی سرکش قوموں کو صفحۂ ہستی سے بے نام و نشان کر سکتا، اور قومِ لوط پر پتھروں کی بارش کر کے انھیں مسمار کر سکتا ہے وہ ان سرکشوں کے ساتھ بھی اگر چاہے تو یہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

بہرحال قرآن مجید کے سہل ہونے کے معنی یہی ہیں کہ اس کی تعلیمات آسان ہیں، وہ جن حقائق کی طرف لوگوں کو متوجہ کرتا ہے وہ فلسفے کے مسائل و مباحث کی طرح پیچیدہ نہیں بلکہ ہر ایک پر واضح ہیں۔ پھر ان پر عمل کرنا بھی دشوار نہیں کیونکہ قرآن کی راہ اصل فطرت کی راہ ہے اور اس کی روش وہی ہے جس کی طرف ہر انسان کی فطرتِ سلیمہ دعوت دیتی ہے مثلاً نماز پڑھو، روزہ رکھو، حج کرو، والدین اور اعزّہ و اقربار کے ساتھ احسان و کرم کا معاملہ کرو، شراب نہ پیو، زنا سے بچو، وعدہ پورا کرو، بنی نوعِ انسان کے ساتھ ہمدردی سے پیش آؤ۔ یہ وہ احکام ہیں جن کو ایک عربی داں جس طرح سمجھ سکتا ہے ایک غیر عربی داں بھی اردو یا کسی اور زبان میں ترجمہ دیکھ کر معلوم کر سکتا ہے۔

فہمِ قرآن سے مراد لیکن سوال یہ ہے کہ فہم قرآن، کے معنی کیا یہی ہیں کہ قرآن مجید کو پڑھ کر بعض چیزوں کے متعلق حسن و قبح کے احکام معلوم ہو جائیں اور بس۔ اگر واقعی یہی مراد ہے تو پھر نہیں اختلاف کی کوئی ضرورت نہیں۔ مگر ظاہر ہے یہ مراد نہیں ہے، بلکہ فہم قرآن سے غرض یہ ہے

کہ انسان مجتہدانہ طور سے احکام کا استنباط کر سکے، قرآن کی کسی آیت کو پڑھ کر اس کے واقعی اور حقیقی مفہوم کو متعین کر سکے اس کے معیارِ بلاغت کو دریافت کر کے یہ سمجھ سکے کہ یہاں کلام کا مقتضائے حال کیا ہے اور کس چیز پر زیادہ زور دینا منظور ہے اس کا مدلول مطابقی اور مدلول التزامی کیا ہے اور یہاں کیا مراد ہے تو یہ بات یقینی ہے کہ اس مراد و غرض کے اعتبار سے فہمِ قرآن کسی ترجمہ کے دیکھ لینے سے حاصل نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لئے خاص خاص شرائط و آداب ہیں کہ جب تک وہ نہ پائے جائیں کوئی شخص فہمِ قرآن کا مدعی نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ مفتی محمد عبدہٗ المصری بیان کرتے ہیں۔

تفسیر کے چند مراتب ہیں۔ ادنیٰ مرتبہ یہ ہے کہ اجمالاً وہ چیز بیان کر دی جائے جو قلب کو اللہ کی عظمت اور اس کے تقدس کے احساس سے پُر کر دے اور نفس کو شر سے روک کر خیر کی طرف لے آئے یہی بات ہے جس کی بنا پر "ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر" کا مژدہ جانفزا ہم کو سنایا گیا ہے۔ لیکن (اس مرتبہ سے تجاوز کر کے) اگر کوئی شخص تفسیر کا مرتبہ علیا حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ بغیر چند امور کے حاصل نہیں ہوتا۔

دور کیوں جائیے خود قرآن کو دیکھئے۔ اس نے جہاں اپنے آپ کو نصیحت کے لئے آسان کہا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ سب آیات یکساں نہیں ہیں بلکہ مراد کے واضح اور مخفی ہونے کے اعتبار سے ان میں باہمی فرق بھی ہے۔ ارشاد ہے۔

هُوَ الَّذِيٓ أَنزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ	وہ خدا وہی ہے جس نے آپ پر کتاب اتاری
اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتٰبِ وَ	اس کی بعض آیتیں عام فہم ہیں وہی کتاب کی
أُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۔ پ ۳	اصل ہیں اور دوسری کئی پہلو والی ہیں۔

پھر اس کے بعد فرمایا گیا۔

فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ	پس جن لوگوں کے دل میں کجی ہے وہ فتنہ کی
فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشٰبَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ	جستجو اور اصل حقیقت معلوم کرنے کی غرض سے

...اِبْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ وَمَا يَعْلَمُ	...کتاب میں سے ان آیات کے پیچھے پڑتے ہیں جن
تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ	میں کئی پہلو نکلتے ہیں حالانکہ ان آیات کی اصل
فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ	حقیقت صرف اللہ اور علماء راسخین جانتے ہیں
مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا	جبکہ وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے سب کچھ
أُولُو الْأَلْبَابِ۔ (پ۳)	ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے اور نصیحت تو عقلمند ہی قبول کرتے ہیں

ان دونوں آیتوں سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں بعض آیات ایسی بھی ہیں جن کی مراد اللہ کے سوا صرف علماء راسخین کو معلوم ہو سکتی ہے۔ ہر شخص خواہ عالم راسخ ہو یا نہ ہو ان آیات کی مراد تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔

قرآن احکام و مسائل کی کتاب ہے

علاوہ بریں یہ بات بھی نہ بھولنی چاہئے کہ قرآن مجید صرف امثال و قصص کی کتاب نہیں ہے بلکہ وہ شخصی اور اجتماعی زندگی کا ایک مکمل دستور العمل بھی ہے۔ جس کے بعد کوئی اور آسمانی کتاب نازل نہیں ہوگی۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ اس کتاب الٰہی میں زندگی کے تمام مسائل کے لئے جزئی تفصیلات مذکور نہیں ہیں اور حق یہ ہے کہ چونکہ ہر زمانہ میں انسانی عقل و شعور کی استعداد اور صلاحیت یکساں نہیں ہوتی بلکہ اس میں عمل ارتقاء برابر جاری رہتا ہے۔ اس بنا پر حکمت خداوندی کا اقتضاء یہی ہونا چاہئے تھا کہ آخری کتاب سماوی میں زندگی سے متعلق صرف اصول بیان کئے جائیں اور ان کی جزئیات سے تعرض نہ کیا جائے

پس جب قرآن میں جزئیات نہیں اور صرف اصول و کلیات کا تذکرہ و بیان ہے تو اب لامحالہ فہم قرآن کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہونا چاہئے کہ اصول سے فروع اور کلیات سے جزئیات کے استخراج و استنباط کی صلاحیت و استعداد ہو۔

اس بیان سے یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ چونکہ استنباط مسائل اور استخراج احکام میں سب لوگ یکساں صلاحیت و استعداد کے مالک نہیں ہو سکتے اس بنا پر ان میں بھی باہمی فرق مراتب ہوگا۔

صحابہؓ فہم قرآن میں برابر نہیں تھے

یہی وجہ ہے کہ ہم عجمیوں اور خیر القرون سے اس درجہ بعد رکھنے والوں کا کیا ذکر؟ خود صحابہ کرام جو بلا واسطہ بغیرے نبوت کی زبانِ حق ترجمان سے قرآن مجید سنتے تھے، اہلِ لسان وصاحب زبان تھے، اور جن کے سینے آفتاب جہاں تاب رسالت کی شعاعوں سے براہِ راست منور تھے، فہم قرآن کے مرتبہ میں یکساں حیثیت کے مالک نہیں تھے۔ تمام صحابہ میں صرف چھ یا سات تھے جو قرآنی حقائق کی توضیح میں مستند مانے جاتے تھے۔ ان حضرات کے اسماء گرامی یہ ہیں۔ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، ابن مسعود، ابن عمر، ابن عباس، زید بن ثابت اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم اجمعین۔ مسروق جو کہ ایک مشہور تابعی مفسر ہیں فرماتے ہیں۔

> میں نے صحابہ کرام سے فیض صحبت اٹھایا تو میں نے دیکھا کہ ان کا علم چھ بزرگوں کی طرف لوٹتا ہے حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، معاذؓ، ابو الدرداءؓ، اور زید بن ثابتؓ[1]

پھر عجیب بات یہ ہے کہ فہم قرآن میں ان چھ یا سات حضرات کا مرتبہ بھی یکساں نہیں تھا یہی مسروق آگے چل کر بیان کرتے ہیں میں نے ان چھ بزرگوں سے شرفِ صحبت حاصل کیا تو دیکھا کہ ان سب کا علم علیؓ اور عبداللہؓ پر ختم ہو گیا ہے۔

یزید بن عمیرۃ السکسکی حضرت معاذ بن جبل کے شاگرد تھے۔ فرماتے ہیں جب حضرت معاذؓ کی وفات ہونے لگی تو انھوں نے مجھکو حکم دیا کہ میں علم صرف چار بزرگوں سے حاصل کروں عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن سلامؓ، سلمان الفارسیؓ، اور ابو الدرداءؓ[2]

بعض خاص خاص صحابہ کا ذوقِ قرآن فہمی

صحابہ کرام میں جو حضرات تفسیر قرآن کی خدمت انجام دیتے تھے ان کے حالات واقوال پر نظر ڈالی جائے تو ان میں ایک اور حیثیت سے بھی فرق نظر آئے گا۔ حضرت عمرؓ کاروبارِ خلافت کو انجام دیتے تھے، فتوحات ممالک اور سیاسی امور کی نگرانی کا کام کرتے تھے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ نہ تو احادیث آپ سے زیادہ تعداد میں مروی ہیں

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۱۰۲۔ [2] الاتقان فی علوم القرآن (سیوطی)

اور نہ قرآن مجید کی تفسیر سے متعلق ہی آپ کے اقوال کثرت سے دیکھنے میں آتے ہیں لیکن دراصل وہ حریم اسلام کے بہترین محرم راز تھے اور ان کی فطرت و طبیعت کو اسلام اور قرآن مجید کی تعلیمات واحکام کے ساتھ ایک رازدارانہ نسبت تھی حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔

ان اللہ وضع الحق علی لسان عمر یقول به — اللہ تعالیٰ نے حق کو عمرؓ کی زبان پر رکھ دیا ہے جس کو وہ کہتے ہیں۔

لیکن ان کی فہم و عقل قضائی تھی یعنی جہاں تک اسلامی احکام کا تعلق ہے حضرت عمرؓ کا فیصلہ ایک بڑی حد تک شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کے منشاء سے قریب ہوتا تھا۔

حضرت ابن عباسؓ کی رمز شناسی رہی یہ بات کہ اس حکم کی حکمت اور اس میں رمز کیا ہے تو غالباً اس معاملہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت عمرؓ پر فوقیت رکھتے ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق دعا کی تھی۔

اللّٰھم فقّھہ فی الدین — اے اللہ تو ابن عباس کو دین میں فقہ عطا فرما۔

بعض روایتوں میں بجائے "فقّھہ فی الدین" کے "علّمہ التاویل" ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ "اے اللہ تو قرآن مجید کی آیات کا صحیح مصداق ابن عباسؓ کو بتادے" [1]

حضرت ابن عباسؓ حضرت عمرؓ کے برخلاف سیاسی کاموں میں حصہ نہیں لیتے تھے حد سے زیادہ محتاط تھے۔ دن رات تعلیم و تعلم اور تدریس و تدرس میں بسر کرتے تھے۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث عموماً انصار کے پاس تھیں، میں حدیث کی جستجو میں کسی انصاری کے پاس آتا اور اس کو دروازے پر سوتا ہوا پاتا تو وہیں دروازے پر بیٹھ جاتا تھا، ہواؤں کے تھپیڑے مجھ کو پریشان کرتے تھے۔ آخرکار بیدار ہونے کے بعد جب میں وہ روایت سن لیتا تو واپس چلا آتا تھا۔ اس انہماک و مشغولیت کے علاوہ حضرت ابن عباسؓ شعر جاہلیت، انساب اقوام، اور تاریخ

---

[1] الاتقان ج ۲ باب طبقات المفسرین۔

عرب سے پورے واقف تھے۔ حضرت عمرؓ بھی ابنِ عباسؓ کی یہ خصوصیت تسلیم کرتے تھے اور جب کبھی انھیں قرآن مجید کے کسی لفظ میں اشکال پیش آتا تو وہ حضرت ابنِ عباسؓ کی طرف ہی رجوع کرتے چنانچہ ایک مرتبہ قرآن مجید کی سورہ عَبَسَ میں جو لفظ "اَبّاً" آیا ہے اس کے معنی کے متعلق چند صحابہ میں اختلاف ہوا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا "چلو ابنِ عباسؓ کے پاس چلیں وہ ہم سب سے زیادہ لغتِ عرب کے جاننے والے ہیں۔"

حضرت مجاہدؒ سے مروی ہے کہ ابنِ عباسؓ نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ارشاد فرمایا "نِعْمَ تَرْجُمَانُ الْقُرْآنِ اَنْتَ" عبداللہ بن مسعودؓ کا قول تھا "نعم ترجمان القرآن عبد اللہ بن عباس"۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس ایک شخص آیا اور پوچھا کہ وہ آسمان اور زمین کونسے ہیں جن کی نسبت فرمایا گیا ہے "کَانَتَا رَتْقاً فَفَتَقْنٰهُمَا"۔ ابنِ عمرؓ نے اس شخص کو خود کچھ جواب نہیں دیا۔ بلکہ ارشاد ہوا "ابنِ عباسؓ کے پاس جاؤ اور ان سے اس کے متعلق دریافت کرو، پھر مجھ سے آکر اسے کہہ جانا۔ حضرت ابنِ عباسؓ کے پاس وہ شخص آیا۔ تو آپ نے جواب دیا "آسمانوں کا رتق تو یہ ہے کہ ان سے بارش نہیں ہوتی تھی اور زمینوں کا رتق یہ تھا کہ ان میں روئیدگی نہیں پائی جاتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فتق کر دیا تو آسمانوں سے بارش ہونے لگی اور زمینوں میں نباتات پیدا ہونے لگیں۔"[1]

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے۔ ایک دفعہ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ کے متعلق صحابہ میں اختلاف ہوا۔ لوگوں نے حضرت عمرؓ سے پوچھا "آپ کیا فرماتے ہیں۔ انھوں نے کہا "میں وہی جانتا ہوں جو ابنِ عباسؓ جانتے ہیں۔"[2]

---

[1] الاتقان ج ۱ ص ۱۱۱۔ [2] یہ سب روایات الاتقان ج ۲ باب طبقات المفسرین سے لی گئی ہیں۔

[3] لیکن یہ بات خاص طور پر لحاظ کے قابل ہے کہ اس علم و فضل کے باوجود خود حضرت ابنِ عباسؓ قرآن مجید کے بعض الفاظ کے معنی اہلِ عرب سے معلوم کرتے تھے۔ ایک روایت میں وہ خود فرماتے ہیں کہ میں فاطر السمٰوات کے معنی نہیں جانتا تھا۔ ایک مرتبہ اتفاق سے دو اعرابی ایک کنوئیں پر جھگڑتے ہوئے میرے پاس آئے۔ ان میں سے ایک بولا "انا فطرتها" میں نے یہ کنواں سب سے پہلے کھودا ہے۔ بس اعرابی کے یہ کہتے ہی فاطر السمٰوات کی مراد میری سمجھ میں آگئی۔ (اتقان حاشیہ صفحہ ۲۳ پر دیکھو)

ہیں اور اس طرح کے سیکڑوں آثار ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ زبان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شرفِ صحبت سے سرفراز ہونے میں یکساں وہم رتبہ ہونے کے باوجود تمام صحابہ فہمِ قرآن میں یکساں نہیں تھے۔ بلکہ ان میں بعض خاص خاص صحابہ ہی ایسے تھے جو درحقیقت ذمہ دارانہ طور پر تفسیرِ قرآن کی خدمت انجام دے سکتے تھے اور ان کی اس خصوصیت کو اجلۂ صحابہ بھی تسلیم کرتے تھے۔ ان کی اس برتری اور فضیلت کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں تھی کہ وہ ذوقِ قرآنی جو محض ایک عطیۂ خداوندی ہے ان کو دوسروں کی بہ نسبت زیادہ افراط کے ساتھ مرحمت ہوا تھا وذالك فضل الله يؤتيه من يشاء۔

تفسیرِ قرآنی میں اسلاف کی احتیاط

ہمارے زمانہ میں ہر شخص جو عربی کی معمولی شد بد رکھتا ہے قرآن کے حقائق و مطالب پر کلام کرنے کا اپنے تئیں مستحق سمجھتا ہے اور ائمہ تفسیر کے عام بیانات کے برخلاف اس کو خود اپنی طرف سے جدت بیانی کرتے ہوئے کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا۔ لیکن آپ کو شاید یہ سُن کر تعجب ہو کہ عہدِ صحابہ و تابعین میں یہ جسارت عام نہیں تھی جیسا کہ ابھی معلوم ہوا۔ ان جماعتوں میں خاص خاص حضرات تھے جو قرآن مجید کی تفسیر بیان کرتے اور کر سکتے تھے۔ اور ان مباحث و مطالب میں وہ مرجع قوم و ملت سمجھے جاتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود یہ حضرات بھی تفسیرِ قرآن کے معاملہ میں حد درجہ احتیاط ہی رکھتے تھے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں "میں نے مدینہ طیبہ کے فقہاء کو دیکھا ہے۔ یہ حضرات تفسیرِ قرآن کے سلسلہ میں گفتگو کرنے کو بڑا اہم اور ذمہ داری کا کام سمجھتے تھے۔ سالم بن عبد اللہ، قاسم بن محمد، سعید بن مسیب اور حضرت نافع ان ہی حضرات میں سے تھے۔" [۱]

یحییٰ بن سعیدؒ کا بیان ہے کہ میں نے ایک شخص کو دیکھا سعید بن المسیب سے قرآن مجید

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲)

علاوہ ہیں بعض الفاظ ایسے بھی تھے جن کی مراد حضرت ابن عباسؓ کو معلوم نہیں ہو سکی خود ان کا بیان ہے "قرآن میں چار الفاظ کے معنی مجھ کو دریافت نہیں ہو سکے۔ حنانا۔ غسلین۔ اواہ۔ رقیم۔ (الاتقان ج ۱ ص ۱۱۳)

[۱] تفسیر ابن جریر ج ۱ ص ۲۸۔

کی کسی ایک آیت کی نسبت دریافت کر رہا تھا۔ مگر آپ نے جواب دیا "میں قرآن سے متعلق کچھ نہیں کہوں گا۔" [۵۱]

حضرت شعبیؒ فرماتے تھے "تین چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلق میں مرتے دم تک کچھ نہیں کہہ سکتا۔ قرآن، روح اور قیاس" [۵۲]

اصمعیؒ کو کون نہیں جانتا۔ لغت و ادب کا کتنا بڑا امام تھا برسوں تحقیق لغات، صحیح محاورات اور ان کے معانی کی فکر میں عرب کے جنگلوں کی خاک چھانتا پھرا ہے اور لفظ لفظ کے لئے عرب کے بدوؤں میں برسوں تک قیام کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود قرآن مجید کی تفسیر میں بالکل خاموش رہتا تھا۔ اس سے کسی آیت کی نسبت دریافت کیا جاتا تو کہتا "عرب اس کے یہ معنی بیان کرتے ہیں میں نہیں جانتا اس سے کیا مراد ہے؟" [۵۳]

ابوطیب کہتا ہے "اصمعی بجید خدا پرست تھا وہ قرآن کی کسی آیت کی تفسیر نہ کرتا تھا"

اس درجہ احتیاط کا سبب غور کیجئے! آخر وہ کونسی بات تھی جس کی وجہ سے یہ اکابر علم و ادب اور ائمہ عربیت و لغت بھی قرآن مجید سے متعلق گفتگو کرنے میں اس درجہ احتیاط کرتے تھے۔ اس کی وجہ بجز اس کے اور کیا ہے کہ یہ حضرات تفسیر قرآن کی اہم ذمہ داری کا کامل احساس رکھتے تھے اور تفسیری اہلیت پیدا کرنے کے لئے جن صفات و اوصاف کی ضرورت ہے یہ حضرات ان میں خواہ کیسا ہی مرتبہ کمال رکھتے ہوں۔ تاہم انھیں تفسیر قرآن کی عظیم الشان ذمہ داری کے پیش نظر اپنے متعلق پورا بھروسہ نہیں ہوتا تھا اور اس بنا پر اس باب میں جسارت سے کام لیتے ہوئے ان کو تردد ہوتا تھا اور حتی الوسع وہ اس سے سبکدوش رہنا چاہتے تھے۔

تفسیر بالرائے پر وعید اور اس کا مطلب اس موقع پر یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ بعض لوگ صحابہ کی اس احتیاط کا سبب ان احادیث و آثار کو بتاتے ہیں جن میں اپنی رائے سے قرآن مجید کے بارہ میں کلام کرنے سے منع کیا گیا ہے یہ شدید قسم کی غلط فہمی ہے جس کے ازالہ کے لئے ہم ذیل میں

[۵۱] و [۵۲] تفسیر ابن جریر طبری ج ۱ ص ۲۸۔ [۵۳] المزہر ج ۲ ص ۲۰۲۔

یہ روایتیں نقل کرتے ہیں اور پھر ان کا مطلب لکھیں گے۔

ان احادیث میں سب سے زیادہ مشہور وہ روایت ہے جو ابو داؤد، ترمذی، اور نسائی میں ہے
اس روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

من تکلم فی القرآن بغیر علم — جو شخص علم کے بغیر قرآن کے بارہ میں کچھ کہتا ہے اس کو
فلیتبوأ مقعدہ من النار — چاہئے کہ دوزخ کو اپنا ٹھکانہ بنالے۔

ابو داؤد سے ایک اور روایت اسی مضمون کی مذکور ہے جس میں بجائے تکلم کے قال ہے
دونوں کا حاصل ایک ہی ہے۔ اسی طرح کی ایک روایت حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے انہیں لفظوں
سے مروی ہے جو ابن جریر ج ۱ ص ۲۶ پر مذکور ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یہ قول بھی اس سلسلہ میں بہت مشہور ہے۔

ای ارض تقلنی وای سماء — مجھکو کون سی زمین اٹھائیگی اور کون سا آسمان
تظلنی اذا قلت فی القرآن — مجھ پر سایہ گستر ہوگا جبکہ میں قرآن میں وہ بات
مالا اعلم (ابن جریر ج ۱ ص ۲۷) — کہوں جسے میں نہیں جانتا۔

لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ قرآن مجید کے معانی میں غور وخوض اور اس سے
احکام و مسائل کا استنباط ہی سرے سے ممنوع کر دیا گیا ہے کیونکہ قرآن نے خود جگہ جگہ اپنی آیات
میں غور وتدبر کی دعوت دی ہے اور ان لوگوں کی تعریف کی ہے جو ان میں انہماک رکھتے اور قرآن
کے حقائق پر غور کرتے ہیں ارشاد ہے۔

کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ مُبٰرَكٌ — یہ وہ مبارک کتاب ہے جو ہم نے آپ کی طرف نازل
لِّیَدَّبَّرُوْٓا اٰیٰتِهٖ وَلِیَتَذَكَّرَ — کی ہے تاکہ لوگ اس کے آیات میں تدبر کریں اور عقلمند
اُولُوا الْاَلْبَابِ۔ — اس سے نصیحت پذیر ہوں۔

اس کے بالمقابل جو لوگ قرآن مجید میں تدبر نہیں کرتے ان کی مذمت کی گئی ہے فرمایا گیا ہے
اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ — کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے یا دلوں پر تالے

اَمۡ عَلٰی قُلُوۡبٍ اَقۡفَالُهَا۔ پڑے ہوئے ہیں۔

اس بنا پر جس حدیث میں قرآن مجید کے متعلق علم کے بغیر گفتگو کرنے کی ممانعت کی گئی ہے اس کا مطلب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ جو لوگ فہم قرآن کا سلیقہ نہیں رکھتے۔ یعنی اس کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے اور جو فہم قرآن کے باب میں مبادی اور اصول موضوعہ کا حکم رکھتی ہیں وہ ان سے بے خبر ہیں۔ ان لوگوں کو محض قیاس و تخمین سے قرآن مجید کے احکام و مسائل یا حقائق و معانی کے بارہ میں گفتگو کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔

غور کیجئے دونوں روایتوں میں "بغیر علم" کے الفاظ ہیں۔ اس بنا پر روایت کا مطلب یہی ہوگا کہ جو لوگ نہ جاننے کے باوجود قرآن کے بارہ میں آزادی کے ساتھ لاابالیانہ انداز میں گفتگو کرتے ہیں وہ اللہ کی وعید کے مستحق ہیں۔ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ اس بنا پر اس قدر شدید وعید کی گئی ہے ورنہ ہر شخص جانتا ہے کہ بغیر علم کے ایک قرآن کیا کسی مسئلہ پر بھی گفتگو کرنا شیوۂ دانشمندی سے بعید ہے ایک عام اور مشہور شعر ہے۔

آں کس کہ نداند و بداند کہ بداند ۔۔۔ در جہل مرکب ابد الدہر بماند[1]

فہم قرآن کے شرائط

بات ذرا طویل ہوگئی۔ بہرحال اب یہ حقیقت ذہن نشین ہوگئی ہوگی کہ فہم قرآن کا معاملہ ایسا آسان نہیں ہے کہ ہر شخص خواہ اہل ہو یا نہ ہو کلام الٰہی کی نسبت طبع آزمائی کرنے لگے۔ لامحالہ دنیا کے عام قاعدہ و قانون کے مطابق اس کے لئے بھی کچھ شرائط اور اصول ہوں گے جن کو حاصل کر لینے کے بعد ہی ایک شخص قرآن مجید میں غور و تدبر اور فکر و تامل کا اہل ہو سکتا ہے۔ اب ہمیں انھیں امور پر غور کرنا ہے جن کے بغیر فہم قرآن کی سعادت کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ بنیادی

---

[1] علامہ سید محمود آلوسی نے ابوداؤد، ترمذی اور نسائی کی ان روایتوں پر اسناد کی حیثیت سے کلام کیا ہے اور الملل والنحل کے حوالہ سے ان کو ضعیف کہا ہے۔

(روح المعانی ج ۱ ص ۶)

لیکن جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا۔ اگر ان روایتوں کو صحیح مان لیا جائے تب بھی ان سے مطلقاً تکلم فی القرآن کی ممانعت ثابت نہیں ہوتی۔

طور پر یہ چیزیں دو قسم کی ہیں۔ ان میں سے ایک کا تعلق علوم و فنون سے ہے جو کسب و اکتساب سے حاصل ہوتی ہیں اور دوسری قسم کی چیزوں کا تعلق عمل اور کردار سے ہے۔ اب ہم ان دونوں کو کسی قدر تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

عربیت | قرآن کو سمجھنے کے لیے پہلی اور ابتدائی شرط عربیت ہے کیونکہ ظاہر ہے قرآن عربی میں نازل ہوا۔ اور اس کے اولین مخاطب عرب ہی تھے۔ قرآن میں خود متعدد مواقع پر اس کا اظہار کیا گیا ہے۔

(۱) إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا ۔ ہم نے اس کتاب کو عربی قرآن بنا کر نازل کیا ہے۔

(۲) وَكَذَٰلِكَ أَنزَلْنَاهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ۔ اسی طرح ہم نے اس کو عربی میں حکم بنا کر اتارا ہے۔

(۳) بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ۔ کھول کر بیان کرنے والی عربی زبان میں اتارا ہے۔

(۴) إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۔ بے شبہ ہم نے اس کو عربی قرآن بنا کر اتارا ہے تاکہ تم سمجھو۔

(۵) فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ۔ ہم نے اس کو تیری زبان میں آسان کر دیا تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔

(۶) وَهَٰذَا كِتَابٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا ۔ اور یہ ایک کتاب ہے جو پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے اور عربی زبان میں ہے۔

ذوقِ لسانی | لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ عربیت سے مراد عربی زبان کی صرف اتنی استعداد نہیں ہے کہ کوئی شخص عربی سے اردو میں یا کسی اور زبان میں ترجمہ کر سکے صرف اتنی استعداد سے ایک شخص قرآن کی اجمالی مراد تو سمجھ سکتا ہے لیکن جب تک اس کا ذوقِ عربیت پختہ نہیں ہوگا اور امام شافعیؒ کے قول جب تک اس میں کسی عربی عبارت کو عربوں کے ہی انداز فہم و تعبیر کے مطابق سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوگی وہ قرآن مجید کے بلیغ اسلوب بیان اور اس کے مخصوص اندازِ تعبیر سے واقف نہیں ہو سکیگا اور اس بنا پر قرآنی مفہوم و مطلب کے بہت سے گوشے اور پہلو ایسے ہوں گے جو اس کے

عقل وفہم کی گرفت میں نہ آسکیں گے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ یہ کوئی عربی کی ہی خصوصیت نہیں ہے بلکہ ہر زبان کا یہی قاعدہ ہے کسی زبان کو جاننے اور بولنے والے سب کے سب یکساں نہیں ہوتے۔ وہی ایک سادہ سا فقرہ اور جملہ ہوتا ہے کہ ایک عامی اور بدذوق اردو داں اسے سنتا ہے اور اس پر خاک اثر نہیں ہوتا۔ لیکن ایک صاحبِ ذوق اسے سنتا ہے تو بے اختیار ہو کر سر دُھننے لگتا ہے۔ اور اس جملہ میں اس کو حقائق و معانی کا ایک دفتر نظر آتا ہے۔ استاد مومن کا یہ شعر

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

کتنے لوگوں نے پڑھا ہوگا لیکن مرزا غالب نے سنا تو کہنے لگے اے کاش! مومن یہ ایک شعر مجھے دیدیتے اور اس کے عوض میں میرا پورا دیوان مجھ سے لے لیتے۔

عربی ادب کی عام کتابوں میں ہے کہ ایک مرتبہ عربی لغت وادب کا مشہور امام اصمعیؒ نے ایک لڑکی سے سنا یہ دو شعر پڑھ رہی تھی۔

استغفر الله لذنبي كله　　قتلت انسانا بغير حله

مثل غزال ناعم في دله　　وانتصف الليل ولم اصله

ترجمہ: میں خدا سے اپنے تمام گناہوں کی معافی طلب کرتی ہوں کہ میں نے ایک انسان کو بغیر جواز کے قتل کر دیا ـــ میں ایک خوش عیش ہرن کی طرح ناز و انداز میں رہی۔ رات آدھی ہو گئی اور میں اس سے نہیں ملی۔

اصمعی نے یہ شعر سنکر کہا، او ہو! تم کس قدر فصیح و بلیغ ہو۔ لڑکی بولی "تم پر افسوس ہے! کیا ان شعروں کو بھی فصیح کہا جا سکتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کا قول۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ　ہم نے حضرت موسیٰ کی ماں پر وحی کی کہ تم اس کو

فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ　دودھ پلاؤ اور جب تم کو ان کے متعلق اندیشہ ہو تو انہیں

وَلَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ اِنَّا رَآدُّوْهُ　سمندر میں ڈالدو اور اس پر نہ خوف کرنا اور نہ غمگین ہونا

اِلَیۡکَ وَجَاعِلُوۡہُ مِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ہم بے شبہ اس کو تمہاری طرف لوٹا دینگے اور پیغمبر بنائیں گے
ان آیات کو پڑھنے کے بعد لڑکی نے کہا "اصمعی! تم دیکھتے نہیں ان میں خدا نے کس طرح دو امر، دو نہی اور دو بشارتیں جمع کردی ہیں۔

بہر حال فہم قرآن کے لئے صرف عربی دانی کافی نہیں بلکہ عربیت کا ذوقِ صحیح درکار ہے اور خوب اچھی طرح یاد رکھئے کہ یہ ذوق محض مقاماتِ حریری، دیوان متنبی اور دیوان حماسہ، یا ایم اے عربی کورس پڑھ لینے سے حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے لئے ایک مدت دراز درکار ہے۔ ذوق سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص کو عربی کلام پڑھتے وقت وہی لذت وسرور حاصل ہو جو اس کو خود اپنی زبان کا اچھا شعر سن کر حاصل ہوتا ہے۔ وہ عربی کے تمام محاورات، ان کے مواقع استعمال سے پورا واقف ہو۔ ایک مفہوم کو مختلف طریقہائے بیان سے ادا کیا جاسکتا ہے، وہ جانتا ہو کہ ایک طریقہ کو دوسرے طریقۂ بیان پر کیا تفوق حاصل ہے۔ فرض کیجئے ایک جملہ تین لفظوں سے مرکب ہے۔ زید آیا اور آج۔ ہر صاحبِ ذوق جانتا ہے کہ ان میں ترتیب بدل دیجئے تو جملہ کا مفہوم ہی بدل جاتا ہے۔ ذوق سے غرض یہ ہے کہ وہ ان باریک باریک فرق سے بھی واقف ہو۔

بعض اوقات کسی کلام میں کوئی لفظ محذوف ہوتا ہے اور اس بناء پر مختلف معنی مراد لئے جاسکتے ہیں، لیکن اہلِ زبان کے نزدیک اس کا صرف ایک ہی مفہوم ہو سکتا ہے اور وہاں وہی مراد ہوتا ہے۔

حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور واقعہ ہے۔ آپ نے ایک مرتبہ اپنے ایک پشاوری مرید سے فرمایا جس کو دہلی میں رہتے ہوئے ایک مدت ہوگئی تھی "میاں ذرا صراحی اٹھا لانا اور دیکھنا پیٹ پکڑ کر اٹھانا" سمجھدار مرید نے کیا کیا۔ ایک ہاتھ سے صراحی کی گردن پکڑی اور دوسرے ہاتھ سے اپنا پیٹ پکڑا۔ اور اس شان سے صراحی حضرت شیخ کے سامنے لاکر رکھدی۔

اس واقعہ سے آپ کو زبان دانی اور ذوقِ زبان کا فرق بیّن طور پر معلوم ہو جائیگا۔ یہ پشاوری مرید عرصہ سے دہلی میں رہنے کے باعث اردو کا زبان داں ضرور ہو گیا تھا لیکن زبان کے ذوق سے

بالکل بے بہرہ تھا۔ ورنہ اسے معلوم ہوتا کہ حضرت مرزا کے جملہ "پیٹ پکڑ کر اٹھاتا" میں اگرچہ یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ پیٹ کس کا ہوگا۔ صراحی کا یا خود اس کا اپنا" تاہم اہلِ زبان کے نزدیک اس کا صرف ایک ہی مفہوم ہو سکتا ہے اور وہ ہے "صراحی کا پیٹ" اور اس کو جاننے کے لئے محض زبان دانی کافی نہیں بلکہ ذوقِ لسانی درکار ہے۔

اسی طرح کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک لفظ بولا جاتا ہے لیکن کسی خاص موقع پر اس سے مراد اس کے اصل معنیٰ نہیں ہوتے بلکہ اس کے برخلاف اس کی ضد مراد ہوتی ہے۔ مثلاً آپ ایک مریض کے پاس اس کی عیادت کے لئے جاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کیا حال ہے؟ مریض جواب میں کہتا ہے "اچھا ہوں"

اہلِ ذوق سے پوشیدہ نہیں کہ اس جملہ کے دو متضاد مفہوم ہو سکتے ہیں فرق صرف لب و لہجہ کا ہے۔ اگر مریض نے بیماری کی درازی اور صحت سے مایوسی کے عالم میں حسرت آمیز لہجہ سے "اچھا ہوں" کہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اچھا نہیں ہوں۔ اس وقت مریض کا یہ اچھا کہنا شعر ذیل کا مصداق ہے

پوچھنے والوں نے میرا ناک میں دم کر دیا　　　جس نے پوچھا حالِ دل کہنا پڑا کچھ بھی نہیں

اور اگر بیمار نے انبساطِ خاطر کے ساتھ اپنے تئیں اچھا کہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ واقعی وہ اب اچھا ہے۔

بسا اوقات جملہ استفہامیہ بولا جاتا ہے اور اس سے غرض کسی شے کے متعلق کچھ دریافت کرنا بھی ہو سکتا ہے اور استفہام انکاری کے طور پر کسی سے انکار کرنا یا بطور استفہام اقراری کسی بات کا اقرار کرنا بھی مراد ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک شخص جو زبان کے ذوق سے بہرہ وافر رکھتا ہے اس جملہ کو سنتے ہی معلوم کر لیتا ہے کہ یہاں متکلم کی مراد کیا ہے۔

ہر کلام کا صحیح مفہوم ایک ہی ہوتا ہے

علماء بلاغت نے اسی بناء پر یہ کہا ہے کہ الفاظ میں ترادف ہے ہی نہیں اور ایک کلام کا مطلب صرف ایک ہی ہو سکتا ہے، غیر زبان داں طرح

طرح کی تاویلیں اور دور از کار توجیہیں کرتا ہے لیکن صحیح مخاطب جب اس کلام کو سنتا ہے تو فوراً ایک ہی مفہوم متعین کر لیتا ہے اور اس کو توجیہات مختلفہ کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے پھرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی۔

بلاغت کے مختلف مدارج و مراتب

یہاں اس حقیقت کو بھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ بلاغت کے مدارج و مراتب لامحدود ہیں یعنی کسی کلام کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ اس پر بلاغت ختم ہے، کیونکہ بلاغت کی تعریف ہے کلام کا مقتضیٰ حال کے مطابق ہونا، اور ذرا ذرا سے فرق سے حال اور مقتضیٰ حال کی مطابقت کی اس قدر قسمیں پیدا ہوتی ہیں کہ ان کا کوئی شمار ہی نہیں ہو سکتا۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ فلسفۂ اخلاق میں کسی قوت کے اعتدال سے جو ملکہ پیدا ہوتا ہے، فضیلت کہلاتا ہے اور اس کے برخلاف قوت کی افراط یا تفریط سے جو ملکات پیدا ہوتے ہیں، رذائل کہلاتے ہیں لیکن کسی ملکہ کا اچھا یا برا ہونا ایک دوسرے کے اعتبار سے ہی متصور ہو سکتا ہے درحقیقت اس کے اقسام کی تحدید و تعیین نہیں کی جا سکتی۔ تھوڑے تھوڑے فرق و امتیاز سے اور قوت اعتدال کی کمی و بیشی کے لحاظ سے جس طرح رذائل بے شمار نکل آتے ہیں فضائل بھی ان کے بالمقابل لاتعداد پیدا ہوتے جاتے ہیں، ٹھیک یہی حال بلاغت کے مدارج و مراتب کا ہے ایک کلام خواہ کتنی ہی بلاغت رکھتا ہو، کسی دوسرے کلام سے کمتر ہو سکتا ہے، ایک طرف بلاغت کے مدارج کا لامحدود ہونا پیش نظر رکھئے اور دوسری طرف علماء بلاغت کا یہ فیصلہ دیکھئے کہ قرآن بلاغت کے اس انتہائی مرتبہ کو حاوی ہے جو کسی کلام کے لئے انتہائی سے انتہائی مرتبہ ہو سکتا ہے۔

اس بیان سے واضح ہو گیا ہو گا کہ عربیت کے ذوق صحیح سے مراد کیا ہے؟ مقصد یہ ہے کہ ائمہ عرب کے کلام کی مزاولت و ممارست سے ایک ایسا پختہ ذوق پیدا ہو جائے کہ وہ عربی کلام کے مدلول و منطوق کو پورے طور پر سمجھ سکے، اس کے اشارات و کنایات سے واقف ہو، الفاظ کا صحیح مفہوم متعین کر سکے اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کو فصیح و بلیغ کلام سن کر حقیقۃً حظ آئے، اور برے کلام سے اس کے ذوق کو صدمہ پہنچے۔

پس ظاہر ہے کہ ایک شخص کا ذوق جس قدر زیادہ لطیف و پاکیزہ ہوگا اسی قدر وہ کلام بلیغ سے محظوظ و شاد کام ہوگا اور اس کو اس میں زیادہ سے زیادہ باریکیاں نظر آئیں گی۔

اس طرح کا ذوقِ عربیت سالہا سال کی عرق ریزی، محنت و کاوش، عمیق و وسیع مطالعہ اور بہترین دماغی و ذہنی صلاحیتوں کے کارآمد بنانے کے بعد ہی حاصل ہو سکتا ہے اور چونکہ قرآن مجید بلاغت کے مرتبہ قصویٰ پر حاوی ہے، اس لئے کوئی شخص بجز ان بزرگانِ کرام کے جن کو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مشکوٰۃِ نبوت سے منور کیا ہو، دعوی کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ کسی آیت کا مطلب وہی ہے جو اس نے سمجھا ہے۔

دنیوی امور میں ماہرین کی طرف مراجعت کی جاتی ہے

جو لوگ دین کے معاملہ میں اس درجہ متساہل واقع ہوئے ہیں غور کریں دنیوی معاملات میں خود ان کی تقلید کا کیا عالم ہے۔ آپ کسی شخص کو اس وقت تک ڈاکٹر تسلیم نہیں کرتے جب تک اس نے باقاعدہ کسی اسکول یا کالج میں ڈاکٹری کا کورس پورا نہ کیا ہو کسی شخص کے قانونی مشورہ کو اس وقت تک درخور اعتنا نہیں سمجھتے جب تک اس نے باقاعدہ وکالت یا بیرسٹری کا امتحان پاس نہ کیا ہو۔ پھر ڈگری کی حیثیت کے اعتبار سے ڈگری یافتہ کے اعزاز و اکرام میں بھی فرقِ مراتب کو ملحوظ رکھا جاتا ہے، ہندوستان کے ایم بی بی ایس یا ایل ایل بی کے قول کا وہ وزن نہیں ہوتا جو انگلینڈ کی کسی طبی ڈگری یا بیرسٹری کے ڈپلومے والے کا ہوتا ہے "نیم حکیم" کے قول کو آپ ہمیشہ "خطرہ جان" سمجھتے ہیں۔ پھر حیرت ہے کہ دین کے معاملہ میں آپ "نیم مولوی" کے فتوے کو "خطرۂ ایمان" قرار نہیں دیتے۔ ترجمہ کی مدد یا عربی کی معمولی شُد بُد حاصل کر لینے سے کسی کو یہ حق ہرگز نہیں پہنچتا کہ وہ مدعیانہ رنگ میں ان لوگوں کے مقابل آئے جنھوں نے اپنی عمریں ان ہی علوم اسلامیہ کی خدمت میں بسر کی ہیں اور جنھوں نے اپنی زندگی کی تمام راحتوں اور آسائشوں کو برباد کر کے قرآنی حقائق و معانی کی چھان بین میں خونِ جگر پیا ہے۔

یہ ہو سکتا ہے کہ آپ سائل کی حیثیت سے اپنے شکوک و شبہات کو علمائے کرام کے سامنے پیش کریں اور ان سے جواب کے طالب ہوں، لیکن آپ کے لئے یہ کبھی جائز نہیں ہو سکتا کہ چند

مخصوص خیالات کو ذہن میں رکھکر عربیت سے بالکل ناواقف ہونے کے باوصف آپ مجتہدانہ انداز میں کلام کرنے کی جسارت کریں، اور جب امام کی بات آپ کے خیال کے مطابق نہ ہو آپ اس پر بے تکلف تبرا شروع کردیں۔ پس آپ کے لئے دو صورتوں کے سوا کوئی اور تیسری صورت نہیں ہے یا خود عربیت کا ذوق پیدا کیجئے علوم اسلامیہ کی تکمیل کر کے ان میں بصیرت و نظر حاصل کیجئے اور اگر یہ نہیں ہے تو ائمہ اسلام پر اعتماد کیجئے اور ان کی بات مانیے۔ آج ہر وہ شخص جو فہم قرآن کا مدعی ہے اس کو بتانا چاہیے کہ وہ کہاں تک اس دعوے کا اہل ہے۔ قرآن بیشک آسان ہے لیکن کسی شے کے آسان ہونے کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ اس کے سمجھنے کے لئے نہ اس کے مبادی جاننے کی ضرورت ہے اور نہ اس کے لئے کچھ اصول موضوعہ ہیں جن کو سمجھنا اور جن پر غور کرنا ضروری ہو۔

تفسیر کی تعریف ابوحیان اندلسی صاحب بحر المحیط نے تفسیر کی تعریف اس طرح کی ہے۔

ھو علم یبحث فیہ عن کیفیۃ النطق	وہ ایک ایسا علم ہے جس میں قرآن مجید کے
بالفاظ القرآن ومدلولاتھا واحکامھا	الفاظ کی کیفیت نطق سے۔ الفاظ کے مدلولات
الافرادیۃ والترکیبیۃ ومعانیھا	اس کے احکام افرادی و ترکیبی اور ان کے
التی تحمل علیھا حالۃ الترکیب	ان معانی سے جن پر الفاظ بحالت ترکیب
وتتمات لذٰلک۔	محمول کئے جاتے ہیں بحث کی جاتی ہے اور
	ان کے علاوہ چند اور تتمات بھی ہیں جن کا علم مفسر کیلئے ضروری ہے

علامہ سید مرتضیٰ زبیدی اس قول کو احیاء العلوم للامام الغزالی کی شرح میں نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

"ابوحیان کے اس قول میں علم جنس ہے اور اس کے بعد جو قیود آئی ہیں وہ بمنزلہ فصل ہیں چنانچہ "یبحث فیہ عن کیفیۃ النطق بالفاظ القرآن" سے مراد علم قرات ہے و مدلولاتھا سے مراد یعنی الفاظ قرآن کے مدلولات ہیں اس کا مصداق فن علم لغت ہے

جس کے بغیر الفاظِ قرآن کے مدلولات کا علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ "احکامھا الافرادیۃ والترکیبیۃ" اس کے لئے علم تصریف، بیان اور بدیع کی ضرورت ہے۔ "معانیھا" سے مراد یہ ہے کہ مفسر کو معانی پر الفاظ کی دلالتِ حقیقی اور دلالتِ مجازی سے واقفیت ہو۔ کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ترکیب اپنے ظاہر کے اعتبار سے کسی چیز کا اقتضا کرتی ہے لیکن اس کے لئے کوئی مانع ہوتا ہے تو اب لفظ سے کوئی معنی مجازی مراد لینے پڑتے ہیں۔

پھر آخر میں ابوحیان نے "وتتمات" جو کہا ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ مفسر کو نسخ اور سبب نزول وغیرہ کا علم ہونا چاہیے تاکہ قرآن میں جو آیتیں مبہم ہیں وہ معلوم ہو سکیں۔ [۱]

ابوحیان کا یہ بیان تو قرآن مجید کی تفسیر سے متعلق عام شرائط پر مشتمل ہے۔ اب ہم ذیل میں خاص عربیت کی شرط سے متعلق بعض ائمہ عربیت کے اقوال نقل کرتے ہیں۔ چنانچہ

علماء سوال کی رائے | امام ابوبکر الباقلانی فرماتے ہیں۔

من زعم انہ یمکنہ ان یفھم شیئاً من بلاغۃ القرآن بدون ان یمارس البلاغۃ بنفسہ فھو کاذب مُبْطِلٌ۔ [۲]	جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ وہ خود بلاغت کی مشق و ممارست کے بغیر قرآن مجید کی بلاغت کو تھوڑا بہت سمجھ سکتا ہے وہ جھوٹا اور باطل گو ہے۔

امام موصوف نے تو صرف بلاغتِ قرآن تک ہی بات محدود رکھی ہے، علامہ سید رشید رضا نے "تفسیر المنار" میں لکھا ہے کہ عربیت کے بغیر کوئی شخص قرآن مجید سے نصیحت پذیر بھی نہیں ہو سکتا کہتے ہیں:-

لا یتعظ الانسان بالقرآن فتطمئن نفسہ بوعدہ و تخشع لوعیدہ الا اذا عرف	کوئی شخص قرآن مجید سے نصیحت پذیر نہیں ہو سکتا بایں معنی کہ پھر اس کا نفس قرآنی وعدوں پر مطمئن ہو جائے اور وعیدوں سے لرز جائے جب تک کہ اس کے معانی کو

[۱] ج ۲ ص ۵۲۹۔ [۲] الاتقان فی علوم القرآن السیوطی

معانیہ۔ ونقائق حلاوۃ — سمجھنے کی اہلیت پیدا نہیں کرلیتا اور اس کے طریقہ

اسالیبہ — بیان کی شیرینی محسوس کرنے نہیں لگتا۔

بیہقی بیان کرتے ہیں امام مالکؒ فرماتے تھے کہ اگر میرے پاس کوئی ایسا شخص لایا جائے جو عربی زبان سے واقف نہ ہو اور اس کے باوجود کلام اللہ کی تفسیر کرتا ہو تو میں اس شخص کو سزا دونگا۔ [1] مجاہدؒ کا مقولہ ہے جو شخص اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ اللہ کی کتاب کے متعلق کلام کرے۔ اگر وہ لغات عرب کو نہیں جانتا۔

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا جو شخص عربیت سے ناواقف ہے وہ بسا اوقات ایک آیت پڑھتا ہے اور اس طرح کسی لفظ کو پڑھتا ہے کہ وہ اس کے لئے باعث ہلاکت بنجاتا ہے۔

ہاں یہ صحیح ہے کہ قرآن مجید نے اپنی نسبت آسان ہونے کا دعویٰ کیا ہے لیکن اس کے باوجود اس نے خود علم کے اعتبار سے لوگوں میں تفریق کی ہے۔ ارشاد ہے۔

لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ — اس کو وہی لوگ جانتے ہیں جو احکام کا استنباط کر سکتے ہیں۔

دیکھئے جہاں تک نصیحت حاصل کرنے کا تعلق ہے صاف طور پر فرمایا جاتا ہے وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ کسی عالم وغیر عالم کی تخصیص نہیں کی جاتی۔ لیکن جب اس کے علم کا ذکر کیا جاتا ہے تو اسے ان لوگوں کے ساتھ مخصوص کر دیا جاتا ہے جو مفہوم کلام پر پورے طور سے حاوی ہو کر احکام کا استنباط کر سکیں۔ اور ظاہر ہے یہ سلیقہ ذوق عربیت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔

کسی زبان کے ادب و بلاغت کا ذوق ایک نعمت خداداد ہے، تاہم اس کے استوار ہونے میں اس زبان کے علوم صرف و نحو، معانی و بلاغت سے بڑی مدد ملتی ہے۔ جب تک اسلام عرب میں محدود رہا اس وقت تک علوم عربیہ میں سے نہ کوئی علم وفن مدون ہوا تھا اور نہ کسی علم کی ضرورت تھی۔ قواعد زبان سے بنتے ہیں نہ کہ زبان قواعد سے۔ یہی وجہ ہے کہ عہد صحابہ میں قرآن مجید کی

---

[1] شرح احیاء العلوم للزبیدی ج ۲ ص ۵۳۹۔

تفسیر کے متعلق اختلاف بہت کم نظر آتا ہے لیکن جب قرآن کی اشاعت عربی زبان نہ جاننے والے ملکوں میں ہوئی اور وہ لوگ کثرت سے اسلام میں داخل ہونے شروع ہوئے تو اب ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کو قرآن فہمی کے قابل بنانے کے لئے عربیت کے علوم و فنون کو مدون کیا جائے۔ چنانچہ صرف ونحو اور دوسرے علوم کی تدوین عمل میں آئی۔

غور کرنا چاہئے جب تک معاملہ اہل زبان تک محدود رہا کسی علم و فن کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی لیکن جب ان سے گذر کر عجمی اقوام تک اس کی رسائی ہوئی تو محض قرآن مجید کو صحیح پڑھنے اور اس کو سمجھ سکنے کے لئے ان تمام علوم و فنون عربیہ کی داغ بیل پڑی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جب تک کوئی شخص عربیت کے تمام علوم جن کی تعداد علماء نے چودہ لکھی ہے بدرجہ کامل حاصل نہیں کرے گا۔ اسے حق نہیں ہے کہ قرآن کی کسی آیت کے متعلق اپنی ذاتی رائے پیش کر سکے اس کے لئے بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ خود مریض ہے تو اطباء پر اعتماد کرے اور ان کے تجویز کئے ہوئے نسخہ کو اپنے لئے پیغام شفا سمجھے۔

یہاں یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ اس کے لئے صرف عربی زبان وادب پر عبور حاصل کر لینا ہی کافی نہیں بلکہ اس سلسلہ میں الفاظ مفردہ جو قرآن مجید میں آئے ہیں ان کے حقائق کو پورے طور پر باخبر رہنا ضروری ہے یعنی ان الفاظ کے لغوی معانی سے گذر کر معلوم کرنا چاہئے کہ نزول قرآن کے زمانہ میں یہ الفاظ کن معانی میں استعمال ہوتے تھے: مثلاً تاویل کا لفظ ہے کہ نزول قرآن کے بہت بعد تفسیر کے معنی میں بولا جانے لگا لیکن خود قرآن میں یہ لفظ اس معنی میں نہیں آیا ہے۔ مثلاً آیت ذیل میں۔

هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا تَأْوِيلَهُ يَوْمَ يَأْتِي تَأْوِيلُهُ يَقُولُ الَّذِينَ نَسُوهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۔ (الاعراف)

کیا یہ لوگ اس بات کے منتظر ہیں کہ [illegible] کے جن کی اس میں خبر دی گئی ہے اسکا مطلب وقوع میں آجائے جس دن اسکا مطلب وقوع میں آئیگا اس دن وہ لوگ کہ پہلے سے بھولے ہوئے تھے کہیں گے بے شبہ ہمارے پاس ہمارے [illegible]

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں اس شخص کو بھی تفسیر بالرائے کی وعید کا مستحق بتایا ہے جو علوم عربیت سے ناآشنا ہونے کے باوجود تفسیر کی جرأت کرتا ہے، چنانچہ تفسیر بالرائے کا مطلب اور اس کا مصداق و مفہوم بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

الثانی ان یتسارع الی تفسیر القرآن	تفسیر بالرائے کا دوسرا مصداق یہ ہے کہ کوئی
بظاہر العربیۃ من غیر استظہار	شخص لفظوں کی محض ظاہری شکل وصورت کو
بالسماع والنقل فیما یتعلق بغرائب	دیکھکر تفسیر قرآن کی جرأت کرے اور قرآن مجید
القرآن وما فیہ من الالفاظ المبہمۃ	میں جو غرائب ہیں اوراق کے علاوہ جو اور الفاظ
والمبدلۃ وما فیہ من الاختصار۔	مبہم مبدلہ یا اور جو اختصار ہے ان کے حل کرنے
	میں سماع اور نقل سے مدد نہ لے۔

کتنے ہی لفظ ہیں جن کے معنی نزول قرآن کے وقت کچھ اور تھے اور دو ایک صدیوں کے بعد وہ کسی اور معنی میں مستعمل ہونے لگے۔ پس جو شخص فہم قرآن کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن مجید کے کسی لفظ سے وہی معنی مراد لے جو عہد نبوت میں اس سے مراد لئے جاتے تھے۔

اصوات ولہجات عرب کا علم | عربیت اور اس سے متعلقہ علوم وفنون کے ساتھ فہم قرآن کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ان تمام لہجوں اور آوازوں سے واقفیت پیدا کی جائے جو نزول قرآن کے وقت عرب میں مستعمل تھے اور پھر اس کا سراغ لگایا جائے کہ قرآن ان میں سے کس کس لہجہ اور آواز پر نازل ہوا ہے ورنہ اس علم کے بغیر فہم قرآن کی کوشش گمراہی کا سبب بن سکتی ہے مثلاً سورہ نمل میں حضرت سلیمانؑ کے قصہ میں ہے "اولا اذبحنہ" جو شخص قراء عرب کی قرأتوں اور ان کی خصوصیتوں سے واقف نہیں ہے وہ اس فقرہ کا ترجمہ نفی کے ساتھ کریگا یعنی یہ کہ میں اس کو (ہدہد) ذبح نہیں کروں گا، لیکن اس کے برخلاف لہجات عرب سے باخبر شخص فوراً سمجھ لیگا کہ دراصل یہ "لا" لائے نافیہ نہیں ہے بلکہ لام کے فتحہ کو ذرا کھینچ دینے کی وجہ سے صورت "لا" کی ہو گئی ہے

اور اسی لہجہ کے مطابق اس لفظ کی قرآن میں کتابت بھی ہوئی ہے۔

لہجہ کا اختلاف تو ایک ایسی چیز ہے کہ خود صحابہ کرام کو بعض مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارہ میں استفسار کرنا پڑتا تھا چنانچہ صفوان بن عسال سے روایت ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یا یحییٰ پڑھتے ہوئے سنا تو عرض کیا "یا رسول اللہ! آپ امالہ کر رہے ہیں حالانکہ یہ تو قریش کا لغت نہیں ہے" آپ نے فرمایا "لیکن ان کے ماموں بنو سعد کا لغت ہے"[1]

دوسری شرط | ان علوم رسمیہ میں کمال حاصل کرنے کے ساتھ دوسری چیز جو قرآن کے مطالب کو بصیرت کے ساتھ سمجھنے کے لئے ازبس ضروری ہے، وہ نور بصیرت ہے، یا دوسرے لفظوں میں اسے "ذوقِ قرآنی" کہہ سکتے ہیں۔ ایک قرآن ہی پر کیا موقوف ہے، دنیا کا کوئی علم و فن ایسا نہیں ہے جس میں کمال اور مجتہدانہ نظر پیدا کرنے کے لئے عام فطانت و ذکاوت کے علاوہ اس علم کے ساتھ ایک فطری لگاؤ ضروری نہ ہو۔ علی گڈھ سے ہزاروں نے بی اے اور ایم اے کا امتحان پاس کیا، لیکن محمد علی مرحوم کی طرح انگریزی کے بہترین ادیب کتنے پیدا ہوئے۔ دیوبند نے ہزاروں علماء کو سندِ فراغت تقسیم کی، لیکن ان میں ایسے کتنے ہیں جو حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ کی سی نظرِ بصیرت رکھتے ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ جب کسی انسان کو کسی خاص فن کے ساتھ دلچسپی ہوتی ہے تو اس کی نظر اس فن کے مسائل کے لئے ایک بیگانہ کی نہیں بلکہ آشنائے دیرینہ کی نظر ہوتی ہے، زندگی کے ہر شعبہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ کسی کام میں کامیابی کا مدار ایک بڑی حد تک اس سے دلچسپی اور فطری لگاؤ پر ہوتا ہے، ڈاکٹری کالج سے اعلیٰ امتحان پاس کرنے والے کیا سب ایک سے ہی ہوتے ہیں، پھر بیرسٹری کی ڈگری رکھنے والے کیا حذاقتِ فن اور کمالِ پیشہ اور مہارتِ قانون کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہوتے؟

یہ چیز مزید بحث و نظر کی محتاج نہیں ہے۔ ہر شخص بداہۃً اس کو جانتا ہے مگر کیا کیجئے

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن ج ۱ ص ۱۰۹۔

اس زمانہ میں جس طرح بعض پرانی نظری باتیں بدیہی بن گئی ہیں، اس کے برخلاف بعض بالکل بدیہی اور مسلّم حقیقتیں بھی نظر و فکر کے حجاب میں پوشیدہ ہوتی جا رہی ہیں۔

کسی فن کے ساتھ یہ فطری لگاؤ اور اس کا ذوقِ صحیح بالکل خداداد بات ہے، یہ نعمت ہر ایک شخص کے حصہ میں نہیں آسکتی۔ اس بنا پر اگر ہم اس فن کے کسی ماہرِ خصوصی کی طرف نسبت کر کے یوں کہہ دیں کہ ہر شخص اس جیسا نہیں ہو سکتا تو کوئی شبہ نہیں کہ ہمارا یہ کہنا بالکل درست اور بجا ہوگا۔ اسی طرح ہم اگر یوں کہیں کہ قرآن مجید کو ہر شخص حضرت ابن عباسؓ یا حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کی طرح نہیں سمجھ سکتا تو اہلِ انصاف جانتے ہیں ہمارا یہ کہنا امرِ حق ہے کوئی شخص اس کی تکذیب نہیں کر سکتا۔ اب اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھئے اور دیکھئے ایک بے خود غلط کرد مجوریٹ کس قدر مضحکہ انگیز بات کہتا ہے۔

"قرآن سب سے زیادہ آسان کتاب ہے۔ نہ یہ ما بعد الطبیعۃ کا فلسفہ ہے، نہ ریاضی کی کتاب کہ اس کے لئے تحقیق کی جائے۔ انسان جس کو خدا نے دو آنکھیں اور دو کان اور ایک صحیح دماغ دیا ہے، وہ قرآن کے سمجھنے کا اتنا ہی اہل ہے جتنا کہ ایک علامۃ الورعی، قرآن کے سارے احکام پر ہمارا عمل ہونا چاہئے، نہ اس میں کسی تاویل کی ضرورت اور نہ کسی تفسیر کی۔"

اس تقریر سے ثابت ہوتا ہے کہ فہمِ قرآن کے لئے اولین طور پر دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک علومِ عربیہ کی مہارت اور دوسرا ذوقِ قرآنی، پہلی چیز کسبی ہے اور دوسری وہبی۔ جس طرح کوئی شخص شعر و ادب کے فطری ذوق کے بغیر شاعر و ادیب نہیں ہو سکتا، ٹھیک اسی طرح "ذوقِ قرآنی" کے بغیر فہمِ قرآن کا اہل بھی نہیں ہو سکتا۔

این سعادت بزورِ بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

علامہ سید رشید رضا نے اسی حقیقت کو اس طریقہ پر بیان کیا ہے:-

"وہ حق جس کے اندر کوئی شک و شبہ نہیں ہو سکتا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

وہ تمام قرآن لوگوں تک پہنچا دیا جو آپ پر نازل ہوا تھا اور اس کو آپ نے وضاحت کے ساتھ بیان بھی کر دیا۔ آپ نے علم دین کی کسی شے کے ساتھ کسی کو مخصوص نہیں کیا ہے اور نہ علم دین میں کسی کو کسی پر فوقیت ہو سکتی ہے البتہ صرف فہم قرآن کی وجہ سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دی جا سکتی ہے اور یہ فہم قرآن دو چیزوں سے حاصل ہوتا ہے ایک ان میں کسبی ہے دوسری وہبی۔ کسبی علوم یہ ہیں مثلاً علم السنت، آثار علماء صحابہ، تابعین، اور صدر اول میں جو علماء امصار تھے ان کے اقوال اور مفردات لغت اور اس کے اسالیب و طرق اور اسی طرح دوسرے علوم و فنون ہیں مثلاً علم فطرت تاریخ عالم نفسیات انسان۔ ان سب علوم سے قرآن کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور یہ سب علوم مکتسبہ ہیں جو کوشش اور جد و جہد سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

اور دوسری قسم وہبی ہے اور یہ وہی ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا ہے کہ "فہم قرآن ایک خاص نعمت ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ اپنے خاص خاص بندوں کو ہی نوازتا ہے" اور اس قسم ثانی کی وجہ سے ہی علوم کسبیہ میں مہارت رکھنے والے علماء ایک دوسرے پر باہمی فضیلت و برتری رکھتے ہیں۔ مگر جو شخص علم عربیت سے ناآشنا اور سنن و آثار سے ناواقف ہے اس کو علم وہبی سے بھی کوئی حصہ نہیں ملتا ہے۔ کیونکہ علم کسبی تو اصل ہے جو علم وہبی کو بطور نتیجہ پیدا کرتا ہے۔"

تیسری شرط اتقاء: دنیا کے مختلف علوم و فنون اور مختلف زبانوں میں مہارت اور بصیرت پیدا کرنے کے لئے خاص خاص شرائط ہوتی ہیں، اگر وہ طالب میں پائی جائیں گی تو اس کو اس علم خاص میں مہارت پیدا ہو سکے گی ورنہ نہیں۔ شیخ بوعلی سینا نے اپنی مشہور کتاب "اشارات" کے آخر میں بڑے زور سے اپنے شاگرد کو نصیحت کی ہے کہ "میری یہ کتاب ہر شخص کو نہ پڑھائی جائے بلکہ ان ہی لوگوں تک اس کو محدود رکھا جائے جو اہل جدل و سفسطہ نہیں ہیں اور اگر اس کے خلاف

کیا گیا تو میں خدا کے ہاں تمہارا دامن پکڑ وں گا" بس اسی طرح قرآن مجید کے مطالب کو واقعی طور پر سمجھنے کے لئے علوم و فنون کی دستگاہ اور زبانِ عربی کے لطیف ذوق کے علاوہ تیسری اہم چیز اتقاء ہے۔

اتقاء سے مراد یہ ہے کہ وہ شخص روحانی اعتبار سے اس بات کی صلاحیت رکھتا ہو کہ کلامِ الٰہی کو سن کر اس کا اثر قبول کر سکے۔ یہ ظاہر ہے کہ کوئی دوا کتنی ہی مفرح اور مقوی ہو لیکن اگر جسم تندرست نہیں ہے اور معدہ و جگر کے فاسد ہونے کی وجہ سے قوتِ ہاضمہ بے کار اور تولید دم کی صلاحیت مفقود ہو گئی ہے تو وہ دوا اپنا اثر نہیں کر سکتی۔ بلکہ بسا اوقات مضر نتائج کے پیدا ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ اسی پر عالمِ روحانی و نفسانی اور اس کے امراض و طرقِ علاج کو قیاس کر لینا چاہئے۔

قرآن مجید نے اپنے تئیں "ھُدًی" "بُشْرٰی" "تذکرہ" اور "نور" کہا ہے مگر ساتھ ہی ان اوصاف کو مطلق نہیں رکھا۔ بلکہ متعدد مواقع پر فرمایا گیا ہے کہ یہ ان ہی لوگوں کے لئے ہدایت ہے جو ہدایت کے طلبگار ہوں۔ جو مومن و مسلم ہوں اور جو طہارت و پاکیزگی کی زندگی بسر کرتے ہوں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۛ	یہ کتاب ہے اس میں شک کی گنجائش نہیں ان
هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ. الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ	پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہے جو غائب چیزوں
بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ	پر ایمان لاتے ہیں نماز پڑھتے ہیں اور ہم نے انکو
مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ. وَالَّذِيْنَ	جو رزق دیا ہے اس سے خرچ کرتے ہیں اور وہ
يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ	لوگ جو ایمان لاتے ہیں ان چیزوں پر جو آپ پر
اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ	اور آپ سے پہلے لوگوں پر نازل کی گئیں اور
هُمْ يُوْقِنُوْنَ۔ (البقرہ)	آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

دوسرے مقام پر فرمایا گیا۔

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ — اور کچھ شک نہیں ہم ان کے پاس ایسی کتاب لائے
عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً — ہیں جس کو ہم نے علم کے ساتھ ایماندار لوگوں کے لئے
لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (الاعراف) — ہدایت اور رحمت بنا کر مفصل بیان کیا ہے۔

ایک مقام پر ھُدًی وبشریٰ للمسلمین اور دوسری جگہ شفاءٌ ورحمۃٌ للمومنین اور ایک جگہ ان فی ذلک لرحمۃ وذکری لقوم یومنون اور ایک مقام پر ھو للذین اٰمنوا ھُدی وشفاء فرمایا گیا ہے۔

ان صلحاء، اتقیاء اور مومنین قانتین کے برعکس وہ لوگ ہیں جو فسق وفجور میں مبتلا ہو کر اعمال بد کرتے ہیں اور دن رات سرکشی میں مصروف رہتے ہیں ان کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ قرآن سے ان کے دلوں میں نور علم وہدایت پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس سے ان کی گمراہیاں اور سرکشی میں ارشاد ہے۔

وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا — اور قرآن مجید ظالموں کے لئے نقصان کو ہی بڑھاتا ہے
وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّا اُنْزِلَ — اور اے نبی جو آپ پر اترا ہے وہ ان لوگوں میں سے
اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا — بہتوں کی سرکشی اور کفر کو زیادہ کرنے والا ہے۔

ایک آیت میں ایمانداروں اور بے ایمانوں میں فہم قرآن اور اس کے اثرات کے اعتبار سے جو فرق ہے بالکل صراحت کے ساتھ یکجائی طور پر بیان کر دیا گیا ہے فرماتے ہیں۔

قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّ — اے نبی آپ کہہ دیجئے کہ قرآن مجید ایمان والوں کیلئے
شِفَآءٌ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ — ہدایت اور شفاء ہے اور وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے
فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ — ان کے کانوں میں گرانی ہے۔ اور وہ ان پر اندھا
عَمًى اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ — ہے۔ یہی لوگ ہیں جو دور کے فاصلے سے پکارے
مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ۔ (حم سجدہ) — جاتے ہیں۔

ایک آیت میں صاف طور پر فرما دیا گیا ہے کہ جو لوگ بدعمل ہیں اور تکبر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ

ان کو آیاتِ قرآنی کے فہم سے محروم کردیگا ارشاد ہے۔

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ	جو لوگ زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں، میں ان کو اپنی
یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ	آیات سے روگرداں کردونگا۔

قرآن سے دو مختلف الطبائع اشخاص پر دو متضاد اثر ہوتے ہیں۔

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ کِتٰبًا	اللہ نے سب سے اچھی بات اتاری ہے یعنی
مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ	یکساں کتاب دہرائی جانے والی اس سے
جُلُوْدُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ	ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں جو اپنے
ثُمَّ تَلِیْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ	پروردگار سے ڈرتے ہیں، پھر اللہ کے ذکر کیلئے
اِلٰی ذِکْرِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُدَی	ان کی کھالیں نرم ہوجاتی ہیں اور ان کے دل
اللّٰهِ یَهْدِیْ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ	بھی۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے جسے چاہتا ہے ہدایت
وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ	دیتا ہے اور جسے اللہ گم کرے اسے کوئی ہدایت
هَادٍ۔ (الزمر)	دینے والا نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کفار و اشرار کو قرآن مجید سے اعراض کرتے ہوئے دیکھتے تھے تو طبعی طور پر رنج ہوتا تھا کیونکہ آپ رحمۃ للعالمین تھے، قرآن سرچشمۂ سعادت و فیض تھا آپ چاہتے تھے دنیا کا کوئی فرد اس سے سیراب ہوئے بغیر نہ رہے۔ لیکن یہ ہو کس طرح سکتا تھا مریض میں دوا کے اثر کو قبول کرنے کی صلاحیت ہی نہ رہی ہو تو طبیب حاذق کیا کرے۔ مرزا غالب نے کیا خوب کہا ہے

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہل بزم — ہو غم ہی جاں گداز تو غمخوار کیا کرے

اللہ تعالیٰ نے آنحضرت کو خطاب کرکے فرمایا:۔

مَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓی ۙ	ہم نے آپ پر قرآن اس لئے نازل نہیں کیا
اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ یَّخْشٰی ۙ	کہ آپ مشقت اٹھائیں۔ مگر ہاں یہ نصیحت ان
(سورۂ طٰہٰ)	لوگوں کیلئے ہے جو ڈرتے ہیں۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث ہے جو عموماً خطبوں میں پڑھی جاتی ہے اس میں ارشاد ہے۔

القرآن حجۃ لک او علیک ۔ قرآن تیرے حق میں دلیل بن کر مفید ہو یا تجھ پر حجت ہو

اس سے مراد یہ ہے کہ اگر قرآن مجید پر عمل کیا جائے، اس کی تعلیم و ارشاد کے مطابق انقا رو طہارت کی زندگی بسر کی جائے تو وہ یقیناً ہدایت کا بہترین سرچشمہ ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو دوسرے لوگ قرآن مجید کی حقیقی مراد کے خلاف اس سے استنباط احکام کریں گے اور گمراہ ہوں گے، وہ الفاظ کے حقیقی مفہوم کو توڑ موڑ کر ان کو ایسے معانی پہنائیں گے جو ہرگز قرآن کی مراد نہیں ہوں گے اس کے برخلاف وہ لوگ ہیں جو دلوں میں خوف خدا رکھتے ہیں۔ روحانیات اور عالم مابعد الموت کے منکر نہیں، زندگی کا مقصد دنیوی شہوات و لذات میں مبتلا رہنا ہی نہیں جانتے۔ بلکہ اخلاق جمیلہ اور فضائل حمیدہ کی روشنی اپنے اندر پیدا کر کے روحانی کمالات حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس طلب صادق، اور اعمال صالحہ کے صدقہ میں اللہ تعالیٰ ان کے دل میں ایسا نور پیدا کر دے گا جس سے عالم غیب کی حقیقتیں خود بخود برانگندہ نقاب ہو جائیں گی اور مادی کثافتوں کے باعث جن غیر مرئی چیزوں پر ایمان لانا ہمارے لئے دشوار ہوتا ہے، وہ خود بخود ان کے آئینۂ قلب میں اس طرح جلوہ ریز ہوں گی کہ ان سے انکار نہیں کیا جا سکے گا اور اس وقت صحیح معنی میں ان کا اعتقاد بالجناں ایمان کی صورت اختیار کر لے گا۔

انقار کی ایک عقلی توجیہ فلسفۂ یونان کے طلباء جانتے ہیں، علم کی تعریف میں کتنا زبردست اختلاف ہے۔ کوئی اس کو حصول صورت کہتا ہے، کسی کے نزدیک حاضر عند المدرک کا نام علم ہے، اور کوئی قوت مدرکہ کو ہی علم بتاتا ہے اور کسی کے خیال میں علم ایک معنی اضافی ہے جو عالم اور معلوم کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ حکماء اشراقیین فرماتے ہیں "علم ایک نور ہے" جو اللہ تعالیٰ کسی کے دل میں پیدا کر دیتا ہے اور وہ معلومات کے ادراک کا منشاء بنتا ہے۔ ہماری رائے میں یہی قول درست ہے اور اسلامی نقطۂ نظر بھی اس کی ہی تائید کرتا ہے۔ چنانچہ امام شافعیؒ کے دو شعر مشہور ہیں۔

شکوت الی وکیع سوء حفظی · فاوصانی الی ترک المعاصی

"میں نے اپنا استاد وکیع سے اپنے بدحافظہ ہونے کی شکایت کی تو انھوں نے گناہوں کے ترک کر دینے کی ہدایت فرمائی"

لان العلم نور من الٰہ · ونور اللہ لا یعطیٰ لعاصی

اور کہا کہ علم خدا کا ایک نور ہے · جو کسی گناہگار کو نہیں دیا جا سکتا

فلسفہ کے نقطۂ نظر سے غور کیجئے تب بھی یہی درست معلوم ہوتا ہے، فلاسفہ نے ادراک کے جو مدارج بتائے ہیں ان میں سب سے اعلیٰ درجہ عقل بالفعل، یا عقل مستفاد ہے۔ اس مرتبہ پر پہنچ کر انسان کو عقل فعال کے ساتھ جو صور معقولہ کا خزانہ ہے، غایت قرب و اتصال حاصل ہو جاتا ہے اور اس اتصال کی بنا پر عقل فعال کی جانب سے جن صور معقولہ کا فیضان ہوتا ہے انسانی ذہن و دماغ ان کو آسانی کے ساتھ قبول کرنے کی صلاحیت و استعداد پیدا کر لیتا ہے۔ شیخ بو علی بن سینا نے اس نفس کو آئینہ کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور بتایا ہے کہ جس طرح آئینہ اپنے مقابل کی صورت کو قبول کر لیتا ہے اور جب تک وہ اس چیز کے مقابل رہے گا اس کی صورت برابر اس میں عکس فگن رہے گی، یہاں تک کہ اگر آئینہ منحرف ہو جائے تو اس انحراف کے مطابق اس چیز کی صورت کے انعکاس میں بھی فرق پیدا ہو جائے گا۔ ٹھیک یہی حال نفس انسانی کا ہے وہ جس قدر مادیت سے بعید اور روحانیت سے قریب ہوگا۔ اسی قدر اس میں عقل فعال کے ساتھ اتصال کی وجہ سے عالم غیب کے حقائق کو قبول کرنے کی صلاحیت زیادہ ہوگی اور اس کے برخلاف نفس کو مادیت میں جتنا زیادہ انہماک ہوگا اسی قدر اس کو عقل فعال سے بُعد زیادہ ہوتا جائے گا۔ اور غیب کی باتیں اس کیلئے ناقابل فہم ہوتی جائیں گی۔

پس قرآن مجید کی تصریحات کے مطابق نفس انسانی میں یہ جِلا اور نورانیت اعمال صالحہ اور تقویٰ و طہارت سے پیدا ہوتی ہے، اور اس کے بعد اس میں یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ قرآن مجید کی روحانی تعلیمات کی حقیقی غرض و غایت کو سمجھ سکے اور اس کے مطالب کو کما ینبغی جان سکے اور اگر یہ نہیں ہے بلکہ اعمال فاسدہ کے حجابات اس کے آئینۂ دماغ و قلب پر پڑے

ہوئے ہیں تو اس شخص سے صحیح فہم قرآن کی توقع عبث ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن مجید نے اس طرح بیان فرمایا ہے۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا	ان کے پاس دل تو ہیں مگر ان سے سمجھتے نہیں،
وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا	اور ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں،
وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا	اور ان کے پاس کان ہیں مگر سنتے نہیں،
أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ	یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی
أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ۔	زیادہ گمراہ یہی لوگ غافل ہیں۔

چوتھی شرط فہم قرآن کے لئے چوتھی شرط یہ ہے کہ ایک آیت میں ایک لفظ کو دیکھ کر ہی اُس کی تفسیر و تاویل کی جرأت نہ کی جائے بلکہ تمام قرآن مجید کا مطالعہ بنظر عمیق کر کے قرآن کی زبان اور اس کے طرز ادا و طریقہ بیان کے ساتھ ایک ایسی مناسبت پیدا کر لی جائے کہ تعیین مراد میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ اور ایک جگہ جو کسی لفظ کے معنی مراد لئے گئے ہوں وہ کسی دوسرے مقام کے منافی نہ ہوں۔

اس کی تفصیل یوں سمجھئے، ہر متکلم کے مخصوص طرق بیان ہوتے ہیں اور جب تک کوئی شخص متکلم کی اس خصوصیت سے واقف نہیں ہوگا وہ اس کے کلام کی مراد واقعی طور پر نہیں سمجھ سکے گا۔ مثلاً قرآن مجید میں طہارت کے باب میں ہے۔

وَإِن كُنتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا ۚ	اور اگر تم ناپاک ہو تو خوب پاک ہو جاؤ اور اگر تم
وَإِن كُنتُم مَّرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ	بیمار ہو یا مسافر ہو یا تم میں سے کوئی قضاء حاجت
أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِّنكُم مِّنَ الْغَائِطِ	سے فارغ ہو کر آیا ہو، یا تم نے عورتوں سے
أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ (الآیۃ)	مقاربت کی ہو۔

"لامستم النساء" کی مراد میں علماء مختلف ہیں، ایک طبقہ کہتا ہے کہ "ملامسۃ" سے مراد محض بدن کا چھونا ہے اور مباشرت نہیں اور اس کی دلیل یوں بیان کرتے ہیں کہ لمس کے معنی حقیقی

چھونا ہے اور جب تک معنی حقیقی کا مراد لینا دشوار نہ ہو معنی مجازی کی طرف رجوع کرنا درست نہیں ہے۔ علماء کا دوسرا گروہ ہے جو اس کو صحیح تسلیم نہیں کرتا اور ملامستہ کے معنی یہاں مباشرت مراد لیتا ہے۔ ہمارے خیال میں اس موقع پر اس بحث میں پڑنا کہ لمس کے معنی حقیقی کیا ہیں اور معنی مجازی کیا؟ اور پھر معنی مجازی اس وقت تک مراد نہیں لئے جاسکتے جب تک کہ معنی حقیقی کے مراد لینے میں تعذر نہ ہو چنداں مفید مطلب نہیں بلکہ ضرورت یہ دیکھنے کی ہے کہ لمس اور اس کے ہم معنی لفظ مس لغت کے اعتبار سے کس معنی میں مستعمل ہوتے ہیں، یہ معلوم کرنے کے بعد یہ دیکھنا چاہئے کہ یہ دونوں لفظ قرآن مجید میں کتنے مقام پر آئے ہیں اور وہاں ان سے کیا مراد لی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں تحقیق وتلاش سے کام لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ زن وشوئی کے تعلقات بیان کرنے میں قرآن مجید کا ایک خاص اسلوب ہے کہ وہ ان مواقع پر تصریح سے کام نہیں لیتا بلکہ کنایۃً ان چیزوں کو بیان کرتا ہے۔ مثلاً ایام حیض میں مجامعت سے منع کرنا منظور تھا تو فرمایا گیا۔

فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ (البقرہ) عورتوں سے بحالتِ حیض الگ رہو۔

طلاق کے احکام میں ہے

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ (البقرہ) اگر تم عورتوں کو ان کو چھونے سے قبل طلاق دو، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

یہاں لفظ مس ارشاد فرمایا گیا ہے مگر مراد مباشرت ہے اسی سلسلہ میں دوسرے مقام پر ہے

وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ (البقرہ) اور اگر تم نے ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے ہی طلاق دیدی ہے اور تم ان کا مہر بھی مقرر کر چکے ہو تو جو تم نے مقرر کیا ہے اس کا آدھا دیدو، مگر ہاں اس وقت نہیں جبکہ یہ عورتیں معاف کردیں۔

اس جگہ بھی مس فرمایا گیا ہے مگر مراد مجامعت ہے۔

پھر عدت کے بیان میں ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ	اے مومنو تم مومنہ عورتوں سے نکاح
الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ	کرنے کے بعد اگر ان کو چھونے سے
قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَیْهِنَّ	قبل طلاق دیدو تو ان کے ذمہ تمہارے
مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا (الاحزاب)	لئے عدت نہیں ہے۔

یہ آیت اس باب میں تصریح ہے کہ مس سے مراد مباشرت ہی ہے کیونکہ عدت استبراء رحم کے لئے ہوتی ہے اس کے نہ ہونے کا حکم اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ فقدانِ مباشرت کے باعث استبراء کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔

ایک جگہ اسی تعلق کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ جبکہ تم میں سے ایک نے اپنے تئیں دوسرے کے حوالہ کر دیا ہو۔

ان آیتوں کے مطالعہ اور ان میں جو مضمون بیان کیا گیا ہے، اس کے طرز ادا کے معلوم کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ "لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ" میں بھی لمس سے مراد محض چھونا نہیں ہے۔

ایک شبہ اور اس کا جواب یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ ان آیاتِ مذکورہ میں تو مس کا لفظ متعدد بار آیا ہے اس لئے یہ لمس کے معنی کے لئے کس طرح حجت بن سکتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ لغت میں مس کے معنی چھونا ہیں اور لمس کے معنی ٹٹولنا ہیں۔ یعنی لمس کے مفہوم میں بہ نسبت مس کے مخالطت میں شدت پائی جاتی ہے پس جب مس سے مراد مباشرت ہے تو لمس سے مراد مباشرت بطریقِ اولیٰ ہو سکتی ہے۔

اس طرح اگر قرآن مجید کے کسی لفظ کی مراد کو متعین کرنے کے لئے خود قرآن مجید سے مدد لی جائے تو غالباً وہ اختلاف و تشتت نہ پیدا ہو جو عموماً تفسیروں میں نظر آتا ہے۔ اور نہ وہ گمراہی پیدا ہو جو قرآن مجید کے طرزِ خطاب و طریقہ بیان سے واقفیت و مناسبت بہم پہنچائے بغیر کسی آیت کی تفسیر سے پیدا ہوتی ہے اور غالباً اسی بناء پر فرمایا گیا۔

القرآن یفسر بعضہ بعضاً قرآن مجید کا بعض حصہ اس کے بعض کی تفسیر کرتا ہے۔

ذکر کی بحث | ایک دوسری مثال یہ ہے کہ قرآن مجید میں آیت ہے۔

وَاذْكُرُوا اللَّهَ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ اور تم چند گنے چنے دنوں میں اللہ کو یاد کرو اور

فَمَن تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ جس شخص نے دو دنوں میں جلدی کی اس پر کوئی

عَلَيْهِ وَمَن تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ گناہ نہیں ہے اور جس نے تاخیر کی اس پر بھی

لِمَنِ اتَّقَىٰ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا کوئی گناہ نہیں ہے۔ یہ ان کے لئے ہے جو خدا

أَنَّكُمْ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ۔ سے ڈرتے ہیں۔ تم اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ تم

(البقرہ) اس کے ہی پاس جمع ہوگے۔

اس آیت میں جو لفظاً ذکر آیا ہے اس سے مراد تمام ائمہ تفسیر کے نزدیک ایام حج میں بمقام منیٰ رمی جمار کرنا ہے۔ اور ایام معدودات سے مراد ایام تشریق ہیں یعنی ماہ ذی الحجہ کی ۱۱، ۱۲، اور ۱۳ تاریخیں۔ اب ایک کج بحث آدمی کہہ سکتا ہے کہ لغت میں تو ذکر کے معنی فقط یاد کرنا ہیں آپ کس طرح ذکر سے مراد ایک مخصوص فعل عبادت (رمی جمار) لے سکتے ہیں۔ اسی طرح معدودات جمع قلت کا صیغہ ہے جو تین سے نو تک پر بولا جاتا ہے، اس میں چند خاص دنوں کا ذکر نہیں اگر اس پر الف لام تعریف کا داخل ہوتا تو اس کو عہد کا مراد لے کر تخصیص پیدا کر سکتے تھے۔ لیکن ایام اور معدودات دونوں نکرہ ہیں پھر ان سے کیونکر چند خاص دن مراد ہو سکتے ہیں پس اگر کسی شخص نے سال کے چند غیر معین ایام میں بھی خدا کو کسی طرح یاد کر لیا ہے تو اس نے اس آیت کا حکم پورا کر دیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں بیشک لغت میں ذکر کے معنی یاد کرنا ہی ہیں لیکن قرآن مجید کا یہ انداز خاص ہے کہ وہ خاص خاص عبادتوں کا نام نہیں لیتا بلکہ ان کی جو اصل روح ہے اس کا ذکر کر دیتا ہے۔ اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو اس عبادت کی اصل غرض معلوم ہو جائے اور وہ اس سے کسی وقت میں بھی غافل نہ ہوں۔ دیکھئے! عرفات سے واپس ہو کر مزدلفہ میں قیام

کرنے کا حکم ہے۔ اس کو یوں بیان فرمایا گیا۔

فَإِذَا أَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا — پھر جب تم عرفات سے لوٹو تو اللہ کو مشعر الحرام
اللَّهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوهُ — کے پاس یاد کرو، اور جس طرح اللہ نے
كَمَا هَدَاكُمْ وَإِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهِ — تم کو بتایا ہے اس طرح یاد کرو، اگرچہ تم
لَمِنَ الضَّالِّينَ۔ (البقرہ) — پہلے سے بے خبر تھے۔

اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ محض زبان سے خدا کو یاد کر لینا یا غیر شرعی اعمال کر کے ذکر اللہ کے فریضہ سے سبکدوش ہونے کی کوشش کرنا بالکل بے سود بلکہ گمراہی ہے، ذکر وہی معتبر ہے جو خدا نے اپنے رسول برحق کے ذریعہ مخصوص طریق عبادت کے ساتھ لوگوں کو بتایا ہے اسی مضمون کی طرف آیت ذیل میں توجہ دلائی گئی ہے۔

فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ — جب تم مامون ہو جاؤ تو اللہ کو یاد کرو اس طریقہ
كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُونُوا — کے مطابق جو اللہ نے تم کو بتایا ہے ایک ایسا
تَعْلَمُونَ۔ (البقرہ) — طریقہ جو تم نہیں جانتے تھے۔

صبح و شام کی نمازوں کو بھی ذکر سے تعبیر کیا گیا ہے، ارشاد ہے۔

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّأَصِيلًا — تم صبح شام اللہ کے نام کو یاد کرو،

ہاں اس میں شبہ نہیں کہ قرآن مجید میں متعدد مقام پر ذکر سے مراد کوئی خاص عبادت نہیں بلکہ صرف یاد کرنا ہے جیسے آیات ذیل میں۔

(۱) وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ — اور اللہ کو تم کثرت سے یاد کرو تاکہ فلاح پاؤ،
(۲) وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ — تم اللہ کو یاد کرو اور اسی کی طرف یکسو
إِلَيْهِ تَبْتِيلًا۔ — ہو جاؤ۔
(۳) رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا — وہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کو اللہ کی یاد سے نہ تو تجارت
بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ۔ — غافل کرتی ہے اور نہ خرید و فروخت۔

لیکن قرآن مجید میں جہاں جہاں لفظ ذکر آیا ہے ان سب مقامات کو پیش نظر رکھنے سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ جن مواقع میں ذکر مطلق نہیں بلکہ کسی خاص زمانہ یا مکان کی قید کے ساتھ آیا ہے وہاں مطلقاً یاد کرنا نہیں بلکہ کوئی خاص طریقۂ عبادت مراد ہوتا ہے پھر وہ طریقۂ عبادت کیا ہوتا ہے؟ اس کی تفصیل یا تبیین یا خود قرآن مجید کرتا ہے یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے قول یا عمل سے اس کا بیان کردیتے ہیں۔ صورت ثانی میں یہ ماننا لازمی ہوگا کہ قرآن نے جو کچھ کہا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مراد متعین کردی ہے جس سے انحراف کرنا کسی طرح جائز نہیں ہوگا اور اس فعل نبوی کو عمل میں لائے بغیر اگر قرآن مجید کے لفظوں کو لغوی معانی کے اعتبار سے کوئی عملی شکل دی گئی تو وہ یقیناً نا معتبر ہوگی۔

اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آیت زیر بحث یعنی "واذکروا اللہ فی ایام معدودات" میں ذکر کو چونکہ "ایام معدودات" کے ساتھ مقید کیا گیا ہے، اس لئے یہاں ذکر سے مراد صرف زبان و قلب سے یاد کرلینا نہیں بلکہ کوئی مخصوص طریق عبادت ہے، وہ کیا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اپنے اقوال مبارکہ اور عمل مقدس سے واضح کردیا ہے کہ وہ "رمی جمار" ہے۔

اب رہی "ایام معدودات" کی بحث تو اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ یہ دونوں لفظ اگرچہ نکرہ ہیں لیکن آیت کا سیاق و سباق بتاتا ہے کہ ان سے مراد چند خاص دن ہیں، وہ دن کون سے ہیں؟ ان کا بیان بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، اس بنا پر اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ تم ایام تشریق میں رمی جمار کرو، پس وہ شخص جو اس آیت کو اس کے ظاہری معنی پر محمول کرکے یہ سمجھتا ہے کہ خدا کو کسی طرح بھی چند دنوں میں یاد کرلینا اس آیت کے حکم کو پورا کردیتا ہے اور اس کے لئے رمی جمار و ایام تشریق کی کوئی قید نہیں وہ یقیناً فہم قرآن سے بہت بعید ہے اور راہ حق سے بے شبہ منحرف ہے۔

احکام قرآنی میں بصیرت پھر جس طرح قرآن مجید کے مفرد الفاظ کے معنی کی تعیین کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ لفظ قرآن میں جہاں جہاں آیا ہے ان سب مواقع کو پیش نظر رکھا جائے اسی طرح کسی آیت سے کوئی حکم استنباط کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ حکم قرآن مجید میں جتنے مواقع میں بیان کیا گیا ہے۔ ان سب کو ملحوظ رکھا جائے اور ہر ایک موقع کے سیاق و سباق پر مبصرانہ نگاہ ڈال کر اس حکم کی اصل روح تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔

اس موقع پر یہ عرض کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ قرآن مجید کی مثال جدید زمانہ کی کسی مرتب مہذب قانونی کتاب کی نہیں ہے جس میں تمام احکام مختلف ابواب اور پھر ہر باب کے ذیل میں مختلف دفعات کے ماتحت ترتیب، اور ایک خاص نظم ونسق کے ساتھ بیان کردیئے جاتے ہیں بلکہ اس کی مثال اس طبیب حاذق کی سی ہے جو مریض کے لحہ بہ لحہ متغیر ہونے والے احوال کو دیکھ کر نسخہ میں ترمیم و تنسیخ کرتا رہتا ہے اور یا وہ فوج کے اس قائد کی طرح ہے جو طریق جنگ کی مصلحتوں اور فریق مخالف کی مورچہ بندیوں اور اصول اقدام و تاخر کے پیش نظر کبھی فوج کو کسی محاذ پر لڑنے کی ہدایت کرتا ہے اور کبھی کسی دوسرے محاذ پر جنگ کرنے کا حکم دیتا ہے کبھی وہ تلوار استعمال کراتا ہے اور کبھی بندوق یا توپ، کبھی وہ آگے بڑھنے کا حکم دیتا ہے اور کبھی فوج کو مصلحتاً پیچھے ہٹاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب احکام اپنی اپنی جگہ نہایت ضروری اور واجب العمل ہیں۔ سطحی طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک حکم دوسرے حکم کے منافی ہے یا ایک نسخہ دوسرے نسخہ کی ضد ہے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ باہمی تضاد اور منافات کے باوجود ان میں کا ہر ایک حکم اور نسخہ اپنے مخصوص موقع و محل کے اعتبار سے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ دوسرا اپنے موقع و محل پر۔ اگر ایک کو دوسرے کی جگہ پر رکھ دیا جائے تو اس کا نتیجہ بجز تباہی اور بربادی کے اور کیا ہو سکتا ہے اور حق یہ ہے کہ جو دین دنیا میں آخری بن کر آیا ہو اس میں ایسی لچک اور تنوع احکام کا ہونا ضروری بھی تھا۔

انسان کی تمام انفرادی اور اجتماعی ضرورتوں پر شامل ہونے کی یہی وہ صفت قرآنی ہے

جس کو حکمت سے تعبیر فرمایا گیا ہے:-

تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْحَكِيمِ ۔ — یہ حکمت والی کتاب کی آیات ہیں۔

ایک جگہ ارشاد ہے:-

ذَالِكَ مِمَّا أَوْحَىٰ إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ (بنی اسرائیل) — یہ اس حکمت میں سے ہے جو آپ کے پروردگار نے آپ پر نازل کی ہے۔

ذَالِكَ نَتْلُوهُ عَلَيْكَ مِنَ الْآيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيمِ (آل عمران) — یہ وہ آیتیں اور حکمت والا ذکر ہے جو ہم تم پر پڑھتے ہیں۔

قرآن مجید کی صفت جامعیت کو ایک دوسرے مقام پر یوں بیان فرمایا گیا۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ (النحل) — اور ہم نے آپ پر قرآن مجید نازل کیا جو ہر چیز کو کھول کر بیان کرتا ہے اور جو مسلمانوں کیلئے ہدایت، رحمت اور بشارت ہے۔

لیکن جن لوگوں کی طبیعت میں کجی ہوتی ہے وہ اس تنوع احکام کو برداشت نہیں کر سکتے ان کی قوت فکر مختلف احکام کو اپنی اپنی جگہ پر رکھنے سے قاصر ہوتی ہے تو وہ کسی ایک طرف جھک جاتے ہیں اور اپنی طرف سے کسی ایک قطعی حکم کا تعین کر لیتے ہیں اسی قسم کے لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن میں فرمایا گیا ہے:-

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ (البقرہ) — کیا تم قرآن مجید کے بعض حصوں پر ایمان لاتے ہو اور بعض کا کفر کرتے ہو تو کیا نہیں ہے اس شخص کی جزا جو تم میں سے ایسا کرتا ہے مگر دنیا کی زندگی میں ذلیل ہونا اور قیامت کے دن وہ لوگ شدید ترین عذاب میں مبتلا کئے جائیں گے اور اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے۔

نکتہ | یہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ ایسے لوگوں کے لئے دنیا میں رسوا ہونے کا ذکر کیوں کیا گیا ہے؟ اس کی وجہ وہی ہے جو ہم نے ابھی ذکر کی یعنی یہ کہ لوگ جب قرآن مجید کے مختلف احکام میں باہمی توازن و تناسب کو قائم نہیں رکھ سکیں گے اور کسی ایک جہت کی طرف مائل و راغب ہو کر ایک ہی حکم کو معمول بہ بنالیں گے تو اس کا نتیجہ بجز اس کے کیا ہوگا کہ انسانی اور اجتماعی ضرورتوں کے دوسرے گوشے تشنۂ تکمیل رہ جائیں اور وہ اس بنا پر دنیوی تباہ حالی کے قعرِ عظیم میں جا پڑیں، جو مریض طبیبِ حاذق کی تجویز کے مطابق نو بنو نسخوں کو استعمال نہیں کرتا اور صرف ایک ہی نسخہ کے استعمال پر جمود کر کے بیٹھ جاتا ہے اس کی امیدِ شفا معلوم!

ناسخ ومنسوخ | احکام کے ظاہری تعارض کو دیکھکر بہت سے مفسرین آیاتِ قرآنی میں ناسخ و منسوخ کے قائل ہو گئے ہیں اور اس کو اتنی اہمیت دی گئی ہے کہ بعض علماء نے اس موضوع پر بھی مستقل کتابیں تصنیف کر ڈالی ہیں۔ علامہ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں: خاص اس موضوع پر اتنے لوگوں نے تصنیفات کی ہیں جن کا شمار نہیں ہو سکتا[۱]۔ پھر ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت علیؓ نے کسی قاضی سے پوچھا "تم ناسخ و منسوخ کو جانتے ہو"؟ اس نے کہا "نہیں" آپ نے فرمایا "تم خود بھی ہلاک ہو گئے اور دوسروں کو بھی ہلاک کروگے" ہماری رائے میں اگر یہ مقولہ درست ہے تو اس سے مراد نسخ کے اصطلاحی معنی نہیں ہیں بلکہ موارد احکام مراد ہیں۔

نسخ سے مفسرین کی مراد | لیکن اگر ناسخ و منسوخ کی معنوی تنقیح کی جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مفسرین نے اگر کسی آیت پر ناسخ و منسوخ کا اطلاق کیا ہے تو محض مجازاً کیا ہے ورنہ در اصل کوئی آیت عام اصطلاحی معنی کے اعتبار سے منسوخ نہیں ہے "نسخ" کے معنی حقیقی ہیں زائل کر دینا۔ اس بنا پر ایک آیت دوسری آیت کے لئے صحیح معنی میں ناسخ اس وقت ہو سکتی ہے جبکہ منسوخ آیت پر عمل کرنا مطلقاً ناجائز قرار دیدیا جائے۔ حالانکہ قرآن کی کوئی ایک آیت بھی ایسی نہیں ہے جس پر مطلقاً عمل کرنا ناجائز ہو۔ مثلاً قرآن مجید میں ایک جگہ مسلمانوں کو

[۱] الاتقان ج ۲ ص ۲

حکم دیا گیا ہے کہ انھیں کفار کے ہاتھوں سے جو اذیت پہنچے اس پر صبر کرنا چاہئے۔ مگر دوسرے مواقع میں نہایت پرزور طریقہ پر جہاد کی ترغیب دی گئی ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ	اے نبی آپ کفار و منافقین کے ساتھ جہاد
وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ (توبہ)	کیجئے اور ان پر سخت ہو جائیے۔
یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِیْنَ	اے مومنو! تم ان کفار سے جنگ کرو جو
یَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْیَجِدُوْا	تم سے قریب ہیں اور چاہئے کہ وہ تم میں
فِیْكُمْ غِلْظَةً (توبہ)	سختی محسوس کریں۔

مفسرین نے آیت صبر علی الایذاء اور آیات جہاد میں تعارض دیکھکر آیات جہاد کو آیت صبر کے لئے ناسخ کہا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا یہ حقیقتاً نسخ ہے؟ صبر کرنے کا حکم اس زمانہ میں تھا جبکہ مسلمان کمزور تھے اور وہ کفار کو جواب ترکی بہ ترکی نہیں دے سکتے تھے مگر جب خدا نے ان کو طاقت و قوت عطا فرما دی اور وہ جنگ کے قابل ہو گئے تو انھیں جہاد کا حکم دیدیا گیا۔

اس بنا پر ان دونوں آیتوں کے ملا دینے سے دو حکم ثابت ہوتے ہیں۔

(۱) اگر مسلمان کمزور ہوں تو انھیں کفار کے مصائب پر صبر کرنا چاہئے اور اندرونی طور پر کوشش کرنی چاہئے کہ وہ قوی ہو جائیں۔

(۲) پھر جب مسلمان قوی ہو جائیں تو انھیں جہاد کرنا چاہئے۔ اب خاموش بیٹھا رہنا اور کافروں کے مصائب برداشت کرتے رہنا ان کے لئے ناجائز ہے۔

غور کیجئے جب دونوں آیتوں سے مختلف حالات کے مناسب دو مختلف احکام مستنبط ہوتے ہیں تو اب ان میں سے کسی ایک کو دوسرے کے لئے ناسخ کس طرح کہہ سکتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ کسی ایک حکم کو دوسرے حکم کے اعتبار سے منسوخ زمانی یعنی ہنگامی طور پر منسوخ کہہ سکتے ہیں۔ جس طرح طبیب ایک نسخہ کو ملتوی کر کے دوسرا نسخہ لکھتا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ اب پہلے نسخہ کا استعمال سراسر ممنوع قرار دے دیا گیا ہے اور وہ کسی حالت میں

بھی قابلِ استعمال نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ اب مریض کی موجودہ حالت کے پیش نظر اس کو یہ نسخہ استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ لیکن اگر اس کی حالت اولیٰ عود کر آئے تو ظاہر ہے کہ اس کو پھر وہ پہلا ہی نسخہ استعمال کرایا جائے گا۔

عام طور پر مشہور ہے کہ سورۃ الکافرون کی آیت "لکم دینکم ولی دین (تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین ہے) منسوخ التلاوۃ نہیں منسوخ الحکم ہے۔ لیکن اگر ذرا غور کیا جائے تو اس کو منسوخ کہنا ہی درست نہیں ہے۔ اس آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کافروں کے اپنے دین پر قائم رہنے پر رضامندی کا اظہار کیا جا رہا ہے جو اس کو منسوخ الحکم قرار دیا جائے بلکہ صورت یہ ہے کہ توحید کا داعی برحق کافروں کو اسلام کی دعوت دیتا ہے اور ایک مرتبہ نہیں بار بار دیتا ہے یہ لوگ اس دعوت کو سن کر صرف اسے قبول کرنے سے انکار ہی نہیں کرتے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمسخر کرتے ہیں اور گستاخانہ برتاؤ برتتے ہیں اور الٹا خود آپ کو اپنا مذہب اختیار کرلینے کی دعوت دیتے ہیں، اس پر آپ کو حکم دیا جاتا ہے کہ ان سے صاف صاف کہہ دیجئے کہ اگر تم دعوتِ اسلام کو قبول نہیں کرتے ہو مت کرو۔ میں بہرحال تمہارے بتوں کی پرستش نہیں کر سکتا۔ تم جانو تمہارا کام " تم کو تمہارا مذہب مبارک ہو اور مجھ کو میرا دین" اب اس تقریر کو ذہن میں رکھ کر پوری سورت پڑھ جائیے اور بتائیے کہ کیا کسی ایک لفظ سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ کفار کو اپنے دین پر قائم رہنے کی اجازت دیدی گئی ہے۔ اس سورت میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس کا حاصل اس مضمون سے زیادہ نہیں جو من شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر یا لنا اعمالنا ولکم اعمالکم میں بیان فرمایا گیا ہے، لیں اس سورت کی کسی آیت پر عام اصطلاحی معنی کے اعتبار سے نسخ کا اطلاق صحیح ہو ہی نہیں سکتا۔

علامہ محمود آلوسی نے اسی سورت کی آخر آیت میں کئی احتمالات بیان کئے ہیں۔ پہلے احتمال کی بنا پر تو انھوں نے صاف کہا ہے۔

والآیۃ علی ما ذکر محکمۃ غیر منسوخۃ   اس احتمال پر آیت محکم غیر منسوخ ہے۔

دوسرا احتمال انہوں نے وہی بیان کیا ہے جو ابھی ہم ذکر کر چکے ہیں اور اس کے متعلق بھی آگے چل کر فرماتے ہیں وعلیہ کا نسخ ایضاً اور اس احتمال پر بھی کا نسخ نہیں ہے۔

اس گفتگو سے مقصد یہ ہے کہ اگر اسی طرح تمام ان آیات میں غور کیا جائے جن کے متعلق نسخ کا ادعا کیا گیا ہے تو یہ حقیقت صاف روشن ہو جائے گی کہ قرآن مجید کی کوئی ایک آیت کسی دوسری آیت سے منسوخ نہیں ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ یا تو لوگوں نے آیت کے کسی لفظ سے کوئی خاص معنی مراد لے کر کوئی حکم خاص استنباط کر لیا ہے اور اس حکم کو چونکہ منسوخ قرار دے دیا گیا ہے اس لئے انہوں نے خیال کیا کہ آیت ہی سرے سے منسوخ ہو گئی ہے، مثلاً قرآن مجید میں ہے۔

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ — تم نے جن عورتوں سے تمتع کیا ہے تم

أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً (النساء) — ان کو ان کے مقررہ مہر دے دو۔

اس آیت کے لفظ "استمتعتم" سے بعض لوگوں نے نکاح متعہ مراد لیا اور اس کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ اس لئے انہوں نے کہا کہ یہ آیت بھی منسوخ الحکم ہے، حالانکہ "استمتعتم" سے مراد لطف اندوز ہونا ہے، متعہ سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی آیت میں کوئی حکم عام بیان کیا جاتا ہے اور اس کے بعد کوئی دوسری آیت آتی ہے جس میں حکم کی کسی خاص موقع و محل کے اعتبار سے تخصیص کر دی جاتی ہے بعض حضرات اس تخصیص پر بھی نسخ کا اطلاق کر دیتے ہیں، مثلاً عدت کے متعلق ایک آیت ہے۔

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ — اور وہ لوگ جو تم میں سے مر جائیں اور

أَزْوَاجًا وَصِيَّةً لِأَزْوَاجِهِمْ — بیویاں چھوڑیں ان پر اپنی بیویوں کے لئے

مَتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ — وصیت کرنا ہے کہ سال بھر تک ان کو فائدہ

(البقرہ) — دیں، گھر سے نہ نکالیں۔

اس سے بظاہر ثابت ہوتا ہے کہ عدتِ وفات ایک برس ہے۔ ایک دوسری آیت ہے

وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْکُمْ وَیَذَرُوْنَ أَزْوَاجًا یَّتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَّعَشْرًا فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ فِیْمَا فَعَلْنَ فِیْٓ أَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ۔ (البقرہ)

اور تم میں سے جو مر جائیں اور بیویاں چھوڑیں تو بیویاں اپنے آپ کو چار مہینے دس دن تک (بطور عدت) روکے رکھیں، پھر وہ جب اس مدت کو پورا کرلیں تو وہ جو کار خیر ہو کریں ان پر کوئی الزام نہیں ہے۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ عدت وفات ایک سال نہیں بلکہ چار ماہ دس دن ہے۔ اب ان دونوں میں تعارض دیکھکر بعض ارباب تفسیر نسخ کے قائل ہو گئے ہیں حالانکہ اگر ذرا تعمق سے کام لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ نسخ یہاں بھی نہیں ہے۔ پہلی آیت میں شوہروں کو حکم کیا جا رہا ہے کہ وفات کے وقت اپنے ورثار کو اس بات کی وصیت کرجائیں کہ اگر ان کی بیویاں سال بھر تک گھر میں رہنا چاہیں تو انھیں رہنے دیا جائے، اس مدت میں وہ اپنے اعزا و اقربا سے مشورہ کر کے اپنے لئے کوئی اچھا انتظام کرلیں گی۔ اخلاقی اعتبار سے یہ بات کس قدر بری ہے کہ ایک عورت جو اپنے شوہر کی رفیقۂ حیات بن کر عرصہ دراز تک ایک گھر میں ساتھ رہی ہے شوہر کی وفات کے بعد اس کے ساتھ ایسی بیگانگی کا معاملہ کیا جائے کہ غریب کو اس گھر میں ایک سال تک بھی قیام کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔

اب رہا یہ امر کہ عورت کب تک عدت میں بیٹھے اور وہ کب تک کسی دوسرے شخص کے ساتھ نکاح نہیں کرسکتی تو اس کے متعلق دوسری آیت میں صاف طور پر بتا دیا گیا کہ عورت کی مدت عدت چار ماہ دس دن ہے (اگر وہ حاملہ نہیں ہے)۔

اب غور فرمایئے! ان دونوں میں کیا تعارض ہے جس کی وجہ سے نسخ کا قائل ہونے کی ضرورت ہو۔ چنانچہ حضرت مجاہد بن جبیر جو مشہور مفسر ہیں ان دونوں آیتوں میں نسخ کے قائل نہیں تھے[1]۔

---

[1] بخاری کی کتاب التفسیر۔

حضرت شاہ ولی اللہ الدہلویؒ "الفوز الکبیر فی علوم التفسیر" میں ان ہی آیات پر کلام کرنے کے بعد فرماتے ہیں:۔

"اللہ تعالیٰ کا قول والذین یتوفون الآیہ جمہور مفسرین کے نزدیک اربعۃ اشھر وعشرا والی آیت سے اور وصیت میراث و تکئی کے حکم سے منسوخ ہے، لیکن ان دونوں میں تطبیق اس طرح دی جا سکتی ہے کہ متوفی کے لئے تو وصیت کرنا مستحب یا جائز ہے، البتہ عورت پر یہ واجب نہیں ہے کہ وہ وصیت کے مطابق رہے۔ حضرت ابن عباسؓ بھی اسی کے قائل تھے اور یہی توجیہ آیت سے ظاہر ہوتی ہے۔ (ص ۱۹)

قرآن میں نسخ کی حقیقت | خلاصۂ کلام یہ ہے کہ کسی آیت کو کسی آیت کے لئے ناسخ کہنے سے اگر مراد یہ ہے کہ منسوخ آیت کا حکم بالکل زائل ہو چکا اور اب اس پر عمل کرنا قطعی طور پر ممنوع قرار دیدیا گیا ہے تو جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا اس معنی کے اعتبار سے کوئی آیت منسوخ نہیں ہے اور اگر بر سبیل مجاز تخصیصِ عام، یا تعیینِ مدت، یا تفصیلِ اجمال پر نسخ کا اطلاق کیا جا سکتا ہے تو ہمیں اس کے تسلیم کرنے میں عذر نہیں کہ اس معنی کے لحاظ سے نسخ کا اطلاق ہو سکتا ہے اور غالب یہ ہے کہ علماءِ اسلام جو نسخ بولتے ہیں اس سے وہ دوسرے معنی ہی مراد لیتے ہیں۔

حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں۔

مراد عامۃ السلف بالناسخ والمنسوخ	ناسخ و منسوخ سے عام سلف کی مراد کبھی حکم کا
رفع الحکم بجملتہ تارۃ وھو اصطلاح	تمام مرفوع ہو جانا ہوتا ہے یہ متاخرین کی اصطلاح
المتاخرین ورفع دلالۃ العام والمطلق	ہے اور کبھی نسخ سے مراد ہوتی ہے عام مطلق ظاہر
والظاہر وغیرھا تارۃ اما بتخصیص	وغیرہ کا رفع کردینا۔ خواہ وہ تخصیص کے ذریعہ ہو
اوتقیید اوحمل مطلق علی مقید	یا تقیید کے یا مطلق کو مقید پر محمول کرنے اور
وتفسیرہ وتبیینہ حتی انھم یسمون	اس کی تفسیر و بیان کے ذریعہ یہاں تک کہ حضرات
الاستثناء والشرط والصفۃ نسخا	استثناء شرط اور صفت کو بھی نسخ کہہ دیتے ہیں

لتضمن ذلك رفع دلالة الظاهر وبيان المراد فالنسخ عندهم وفي لسانهم هو بيان المراد بغير ذلك اللفظ بل بأمر خارج عنه ومن تأمل كلامهم رأى من ذلك فيه ما لا يحصى وزال عنه به اشكالات أوجبها حمل كلامهم على الاصطلاح الحادث المتأخر۔[1]

کیونکہ یہ دلالت ظاہر کے رفع اور بیان مراد کو متضمن ہوتا ہے پس نسخ ان کے نزدیک اور ان کی زبان میں اس لفظ کے غیر سے مراد کا بیان کر دینا ہے، اور غیر لفظ ہی نہیں بلکہ کبھی مراد کا بیان کسی امر خارج سے بھی ہو جاتا ہے جو شخص ان اسلاف کے کلام میں تامل کرے گا اس کو اس میں غیر محدود فوائد نظر آئیں گے اور اس سے وہ اشکالات زائل ہو جائیں گے جو نسخ کو اصطلاح حادث و متاخر پر محمول کر کے پیش آتے ہیں۔

علامہ ابن حزم ظاہری نے ایک اور نکتہ پیدا کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ نسخ کی حقیقت بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کوئی چیز کسی مدت کے لئے حرام کرتا ہے (اگرچہ وہ مدت ہم کو نہیں بتائی جاتی لیکن وہ اللہ کے علم میں ہوتی ہے) پھر وہ اس کو مباح کر دیتا ہے یا اس کے برعکس کوئی چیز کچھ مدت کے لئے مباح ہوتی ہے۔ پھر اس کی مدت گذرنے پر اس کو حرام کر دیا جاتا ہے یعنی یہ نہ کہنا چاہئے کہ ایک حکم نے دوسرے کو منسوخ کر دیا بلکہ یہ تعبیر زیادہ صحیح ہوگی کہ ایک حکم کے بعد دوسرا حکم نازل ہوا کیونکہ نسخ بمعنی حقیقی تو یہ ہے کہ پہلا حکم باقی ہو اور پھر دوسرا حکم اس کو مرفوع کر دے اور ظاہر ہے کہ اس قول کے بموجب یہاں یہ صورت نہیں ہے۔ علامہ کے اپنے الفاظ یہ ہیں

وما ههنا شيء أصلا الا ان الله تعالى اراد ان يحرم علينا بعض ما خلق مدة ما ثم اراد تعالى ان يبيحه واراد ان يبيحه لنا

اور یہاں بجز اس کے کوئی شے نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی بعض مخلوق چیزوں کو ہم پر کچھ مدت کیلئے حرام کرنے کا ارادہ کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ اس کو مباح کر دے اور اللہ نے اپنی بعض

[1] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۲۹۔

بحل ما خلق مدة ما شاء الله تعالیٰ مخلوق کو کچھ مدت کیلئے ہمارے واسطے مباح کریگا

ان یحرمہ علینا۔ [1] ارادہ کیا پھر اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ اس کو ہم پر حرام کردے۔"

علامہ ابوبکر جصاص فرماتے ہیں: نسخ کے معنی لغت میں خواہ کچھ ہی ہوں بہرحال شرع میں اس کے معنی حکم یا تلاوت کی مدت کے بیان کر دینے کے ہیں۔ پھر آگے چل کر بعض متاخرین کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"تم جانتے ہو قرآن مجید میں عام بھی ہے اور خاص بھی، محکم بھی ہے اور متشابہ بھی۔ پس وہ شخص جو قرآن میں نسخ کے وجود کا قائل نہیں ہے گویا وہ قرآن میں عام و خاص اور محکم و متشابہ کو بھی نہیں مانتا۔ کیونکہ اس کے قول کے مطابق تو یہ لازم آتا ہے کہ تمام آیات کا ورود ایک ہی شان کا ہو۔" [2]

اس تقریر سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن کی بعض آیات پر جب نسخ کا اطلاق کیا جاتا ہے تو اس سے مراد ازالہ نہیں ہوتا بلکہ صرف یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ فلاں آیت میں جو یہ حکم بیان کیا گیا تھا وہ فلاں وقت اور اس زمانہ کے مخصوص حالات کے اعتبار سے تھا۔ اب جبکہ حالات دوسرے ہیں، ان کے لئے حکم یہ ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ فلاں قسم کے احوال کے لئے فلاں حکم ہے اور فلاں قسم کے احوال کے لئے فلاں حکم۔ اس سے کسی ایک حکم کا مطلقاً ممنوع ہو جانا لازم نہیں آتا بلکہ یہ تفصیل و تشریح عین کمالِ دین کی دلیل ہے۔

اصل یہ ہے کہ تمام بحثیں ہوتی رہیں مگر کبھی نسخ کے معنی اور اس کی مراد کی تنقیح کما حقہ نہیں کی گئی یہی وجہ ہے کہ جن بزرگوں نے نسخ کو مانا ہے وہ خود آیاتِ منسوخہ کی تعداد میں بیحد مختلف ہیں۔ پہلے عوام میں مشہور تھا کہ قرآن مجید میں پانچسو یا تین سو آیات منسوخ ہیں۔ کسی نے کہا کہ صرف پچیس آیات منسوخ ہیں، حضرت ابن عباسؓ سے بعض لوگوں نے روایت کی کہ بیس آیات منسوخ ہیں، جن کو علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے بھی نظم کر دیا ہے۔ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے

---

[1] الاحکام فی اصول الاحکام ج ۴ ص ۱۵۹ [2] احکام القرآن ج ۱ ص ۹۰۔

"فوز الکبیر فی اصول التفسیر" میں نسخ پر مستقل ایک فصل میں بحث کی ہے۔ اس میں آپ علامہ جلال الدین سیوطیؒ کی کتاب "الاتقان" کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ شیخ ابن عربیؒ کے قول کے مطابق تقریباً بیس آیات منسوخ ہیں، اس کے بعد فرماتے ہیں "فقیر را در اکثر بست نظر است" چنانچہ آپ نے ابن عربی کی پوری تقریر نقل کی ہے اور اس پر جابجا تعقبات کئے ہیں۔ ہم یہاں اس طویل تقریر میں سے صرف ایک آیت کا ذکر کرتے ہیں۔ ابن عربی فرماتے ہیں۔

"اللہ تعالیٰ کا قول وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ منسوخ ہے اور اس کے لئے ناسخ دوسری آیت فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ہے"

حضرت شاہ صاحبؒ اس پر تعقب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ اس کو نسخ کہنا صحیح نہیں۔ میرے نزدیک اصل صورت یہ ہے کہ "یطیقونہ" میں جو ضمیر منصوب ہے وہ صوم کی طرف نہیں بلکہ طعام کی طرف راجع ہے اور فدیہ سے مراد فدیۂ صوم نہیں بلکہ صدقۃ الفطر ہے۔ اس بنا پر اس آیت کے معنی یہ ہوگئے کہ جو لوگ طعامِ مسکین دینے کی طاقت رکھتے ہیں، انھیں صدقۃ الفطر ادا کرنا ضروری ہے۔ طعام یہاں اگرچہ لفظوں میں متقدم نہیں ہے لیکن رتبۃً مقدم ہے۔ اس لئے اضمار قبل الذکر بھی لازم نہیں آتا۔ حضرت شاہ صاحبؒ ابن عربیؒ کی تقریر پر اسی طرح تعقبات کرتے چلے گئے ہیں اور بالآخر فرماتے ہیں۔

قلت وعلی ما حررنا لا یتعین النسخ الا فی خمس آیات۔	میں کہتا ہوں ہماری تحریر کے مطابق نسخ صرف پانچ آیات میں ہے۔ (ص ۱۸-۲۱)

آپ کے بعد مفتی محمد عبدہٗ المصری کا زمانہ آیا تو انھوں نے کہا کہ قرآن مجید میں ایک آیت بھی منسوخ نہیں ہے۔

ہم سمجھتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ نسخ کے اصل مفہوم کی جتنی تنقیح ہوتی رہی، آیات منسوخہ کی تعداد بھی اسی کے مطابق کم ہوتی رہی، یہاں تک کہ یہ حقیقت خود بخود واضح ہوگئی کہ درحقیقت قرآن مجید میں ایک آیت بھی منسوخ نہیں۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ہماری تقریر سے یہ شبہ نہ ہونا

چاہیے کہ ہم نسخ کے بالکل قائل ہی نہیں ہیں، ماحصل یہ ہے کہ جس مذہب میں اشخاص اور قوموں کی تدریجی اور حالات و نفسیات کے مطابق اصلاح کا کامیاب اصول پیش نظر رکھا گیا ہو اس میں نسخ کا ہونا ناگزیر ہے۔ نسخ کی دو قسمیں ہیں۔ نسخِ آیات اور نسخِ احکام، ہم اس میں سے دوسری قسم کے نسخ کے قائل ہیں نسخ آیات کے نہیں، پھر نسخِ احکام کی دو صورتیں ہیں۔ اول یہ کہ ایک حکم دوسرے حکم کو بالکل رفع کر دے جیسے کہ متعہ کی اباحت کا حکم جو قطعی طور پر زائل کر دیا گیا ہے، یا حضرت رسالتمآب کا یہ ارشاد:۔

كنت نهيتكم عن زيارة القبور | تم پہلے تم کو قبروں کی زیارت سے منع
ألا فزوروها | کرتا تھا۔ اب تم ان کی زیارتیں کرو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد آپ کے پہلے حکم تحریم زیارت قبور کے لئے ناسخ ہے دوسری صورت یہ ہے کہ نسخ بمعنی تفصیل مجمل، تبیینِ مبہم اور تقیید مطلق ہو، نسخ احکام ان دونوں معنوں کے اعتبار سے سنت میں تو پایا جاتا ہے، لیکن قرآن مجید میں صرف دوسرے معنی کے ہی اعتبار سے یہ نسخ پایا جاتا ہے، جیسا کہ ہم ابھی بیان کر آئے ہیں۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ | آپ فرمائیں گے اگر ایسا ہی ہے تو قرآن مجید کی آیت

مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا | ہم کسی آیت کو منسوخ کرتے یا بھلا دیتے ہیں
نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا۔ | تو اس سے بہتر یا ایک آیت لاتے ہیں۔

کا کیا مطلب ہے؟ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی آیات میں نسخ موجود ہے، اس شبہ کے جواب کئی ہو سکتے ہیں، یہاں صرف دو کا ذکر کر دینا کافی ہوگا۔

پہلا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں آیة کا لفظ مطلق ہے اس سے صرف قرآن مجید کا حکم یا قرآن مجید کی کوئی آیت ہی مراد لینا صحیح نہیں ہے۔ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ یہاں آیت سے مراد وہ احکام ہیں جو اسلام سے قبل دوسرے ادیان و شرائع کے موجود تھے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ان کو منسوخ کر کے دوسرے احکام بیان کئے جائیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے بلکہ یہ احکام بہ نسبت

احکام سابقہ کے بہتر ہوں گے۔

صاحب تفسیر المنار نے مفتی محمد عبدہٗ المصری کی ایک طویل تقریر آیت نسخ کی تفسیر کے ذیل میں نقل کی ہے ہم اس کا خلاصہ ذیل میں درج کرتے ہیں اس سے ہماری تائید ہوتی ہے۔

"علماء اشاعرہ کے فہم میں تحیر ہیں جیسا کہ انھوں نے بیان کیا ہے۔ یہاں تک کہ بعض نے کہا ہے کہ "ننسھا" کے معنی بغیر نسخ کے آیت کو اس کی اپنی حالت پر چھوڑ دینا ہے اور تم جانتے ہو کہ یہ معنی اگر لغتہً صحیح بھی ہوں تب بھی اس کی تفسیر کے شایاں نہیں کیونکہ کسی آیت کو بغیر نسخ کے اس کو اپنی حالت پر چھوڑتے ہوئے اس سے بہتر کوئی آیت لانے کے معنی ہی کچھ نہیں صحیح معنی جو آیت کے سیاق کے ساتھ آخر تک متناسب رہتے ہیں یہ ہیں کہ یہاں آیت سے مراد وہ نشانیاں ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ انبیاء کی تائید کرتا ہے، تو اب مراد یہ ہوئی کہ ہم اگر کسی نبی کی نبوت پر دلالت کرنیوالی کسی دلیل کو ترک کر دیتے ہیں تو اس سے بہتر کوئی دوسری دلیل اس کی جگہ قائم کر دیتے ہیں، یا اگر مدت دراز گزر جانے کے باعث ہم اس کو لوگوں کی یاد سے زائل کر دیتے ہیں تو اپنی قدرت کاملہ سے ایک ایسی دلیل اور پیدا کر دیتے ہیں جو پہلی دلیل سے بھی زیادہ قوی اور نبوت کو ثابت کرنیوالی ہو۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے پاس صرف ایک ہی دلیل نہیں ہے جو وہ تمام انبیاء کو عطا فرماتے۔"[1]

دوسرا جواب یہ ہے کہ اچھا مان لیا کہ آیت سے مراد آیت قرآن ہی ہے لیکن "ننسخ" کے معنی حکم کو بالکل زائل کر دینے کے نہیں ہیں بلکہ تبدیل حکم کے معنی ہیں جیسا کہ اس کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے۔

وَاِذَا بَدَّلْنَا اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ	اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت رکھتے
وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْا	ہیں اور اللہ جس چیز کو نازل کرتا ہے اس کو بہتر جانتے
اِنَّمَا اَنْتَ مُفْتَرٍ ۔ (النحل)	ہیں تو یہ لوگ کہتے ہیں آپ افترا باندھنے والے ہیں۔

[1] تفسیر المنار ج ۱ ص ۴۱۴۔

اس تبدیلِ آیت بالآیت کا مفہوم کیا ہے یہ کہ ایک زمانہ میں کسی حکم خاص کے لئے کوئی آیت نازل ہوئی، پھر جب حالات بدل گئے تو دوسری آیت نازل ہوئی اور اس میں حکمِ جدید کا امر فرمایا گیا۔ اس کا مآل یہ ہوا کہ دو مختلف حالات کے اعتبار سے دو مختلف احکام نازل ہوئے، اور دونوں اپنی اپنی جگہ برحق اور درست ہیں مسلمان کمزور تھے۔ کافروں اور مشرکوں کی مقاومت نہیں کرسکتے تھے تو صبر کا حکم نازل ہوا، پھر جب وہ قوی ہوگئے تو انھیں جہاد کرنے کا حکم دیدیا گیا یہ دو حکم ہیں جو جس طرح پہلے درست تھے اب بھی ہیں جس طرح قابلِ عمل پہلے زمانہ میں تھے اب بھی ہیں۔ تبدیلِ آیت بالآیت کی حقیقت یہ ہے اور بس، کفار و مشرکین اس تنوعِ احکام کو برداشت نہیں کرسکتے۔ طعن و تشنیع کرنے بیٹھ جاتے ہیں اور کہنے لگتے ہیں کہ آپ کبھی کوئی حکم دیتے ہیں اور کبھی کوئی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ اپنی مصلحتوں کو بہتر جانتا ہے، اسے معلوم ہے کہ کب اور کس وقت کونسا حکم ہونا چاہئے اور کس وقت کونسا۔ پس دوسرے جواب کا لُبّ لباب یہ ہے کہ آیتِ بالا میں جو حقیقت بیان فرمائی گئی ہے وہی مَا نَنْسَخْ والی آیت میں بھی بیان کی گئی ہے۔ اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں نسخ بمعنیٰ ازالۂ حکم مطلقاً پایا جاتا ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر کے ماتحت جو تقریر کی ہے اس سے بھی اس کی ہی تائید ہوتی ہے، فرماتے ہیں:۔

> "جاننا چاہئے کہ احکامِ شرعیہ میں نسخ کا حال احکامِ تکوینی میں نسخ جیسا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ تمام احکامِ الٰہیہ خواہ شرعی ہوں یا تکوینی لوحِ محفوظ میں موجود اور ثابت ہیں اور ان کی دو قسمیں ہیں احکامِ خاص، احکامِ عام، پھر جو احکامِ خاص ہیں ان کی دو قسمیں ہیں یا تو کسی ایک شخص یا چند اشخاص کے ساتھ مخصوص ہوں گے اور یا کسی زمانہ کے ساتھ مخصوص ہوں گے، خواہ وہ زمانہ قلیل ہو یا کثیر پس جو احکام کسی شخص کے یا زمانہ کے ساتھ مخصوص ہونگے وہ اس شخص اور زمانہ کے باقی رہنے تک باقی رہیں گے۔ احکام میں یہ تغیر و تبدل ہمارے اعتبار سے ہے ورنہ خدا کے نزدیک سب احکام برابر ہیں" (تفسیر عزیزی ۳۹۲)

ناسخ و منسوخ کی بحث بیاں ضمناً آ گئی ورنہ دراصل اس بحث کے لئے مستقلاً ایک ضخیم کتاب درکار ہے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ وہ شخص جو فہم قرآن کی سعادت سے بہرہ اندوز ہونا چاہتا ہے اس کے لئے جس طرح یہ ضروری ہے کہ مفردات قرآن کے معانی کی تعیین کے لئے خود قرآن کی طرف رجوع کرے، اسی طرح استنباط احکام کے لئے ضروری ہے کہ کسی چیز کے متعلق قرآن مجید میں جتنے احکام آئے ہیں ان سب کو یکجا کر کے ان میں باہمی تناسب و توازن پیدا کرنے کی کوشش کرے اور یہ معلوم کرے کہ کونسا حکم کس زمانہ کے لئے تھا اور کونسا کس زمانہ کے لئے، ایک کا مورد و محل کیا ہے اور دوسرے کا کیا؟ ایک کا کیا منشا ہے اور دوسرے سے کیا مراد ہے؟ قرآن مجید میں اگر غور کرنے والا احکام متنوعہ کے ان باہمی فروق کو نظر انداز کر کے ان میں ایک خاص توازن و تناسب پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرے گا تو قدم قدم پر اس کو مشکلات پیش آئیں گی اور کہیں وہ "ناسخ و منسوخ" کہہ کر اپنی گلو خلاصی کا سامان کرے گا اور کہیں ایسی رکیک تاویل و توجیہ کرے گا جو قرآن کے منشا کے بر عکس ہوگی۔

تفسیر و تاویل کا فرق اس موقع پر ضروری ہے کہ تفسیر و تاویل کا فرق بھی معلوم کر لیا جائے تفسیر "فسر" سے مشتق ہے۔ جس کے معنی کھولنے اور بیان کرنے کے ہیں۔ اور "تاویل" کا مادہ اشتقاق "اول" ہے جس کے معنی لوٹنے اور رجوع کرنے کے ہیں۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ "ایالت" سے مشتق ہے جس کے معنی سیاست ہیں۔ تاویل کرنے والا بھی چونکہ کلام کی سیاست پر واقف ہو کر اس کو اپنے موضوع و محل میں رکھتا ہے، اس لئے اس متکلم کو "موول" اور اس کے اس فعل کو "تاویل" کہتے ہیں۔ لیکن یہ وجہ ضعیف ہے۔ کما لا یخفی علی من له بصیرة فی مناهج استعمال الالفاظ ابو عبید اور ایک گروہ کا خیال تو یہی ہے کہ تفسیر و تاویل باعتبار معنی ایک ہیں لیکن دراصل یہ صحیح نہیں ہے۔ ابن حبیب نیشاپوری بر سبیل طنز کہتے ہیں۔

"ہمارے زمانہ میں ایسے مفسر پیدا ہو گئے ہیں کہ اگر ان سے تفسیر و تاویل میں فرق دریافت کیا جائے تو انھیں پتہ بھی نہ چلے۔ (شرح احیاء العلوم ج ۴ ص ۵۲۵)

امام راغب اصفہانی تفسیر و تاویل میں عام خاص مطلق کی نسبت بتلاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ تفسیر کا اطلاق بیشتر الفاظ و مفرداتِ کلام پر ہوتا ہے اور تاویل کا جملوں اور معانی پر، اور دوسرا فرق یہ بیان کرتے ہیں کہ تاویل عموماً کتب الہیہ میں ہوتی ہے اور تفسیر کتب الہیہ و غیر الہیہ دونوں میں، لیکن ہمارے خیال میں زیادہ دلپسند اور صحیح فرق وہ ہے جو ابو طالب الثعلبی نے بیان کیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ تفسیر کے معنی لفظ کی وضع کا بیان کر دینا ہے خواہ وہ حقیقت ہو یا مجاز مثلاً "صراط" کے معنی راستہ "صیب" کے معنی بارش اور "کفر" کے معنی انکار۔ اور تاویل کہتے ہیں باطن لفظ کی تفسیر کرنے کو۔ گویا تاویل کے معنی ہیں حقیقتِ مراد کی خبر دینا، اور تفسیر کے معنی ہیں دلیلِ مراد کی خبر دینا، کیونکہ لفظ کا شغف مراد ہونے کے لحاظ سے دلیلِ مراد ہوتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ قرآن مجید میں ہے اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ اس کی تفسیر تو یہ ہے کہ "مرصاد" رصد سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں گھات میں رہنا اور نگرانی رکھنا۔ اس لئے مطلب یہ ہوا کہ تمہارا رب تمہارے اعمال کی دیکھ بھال رکھتا ہے۔ اس کی تاویل یہ ہے کہ ہم کو برے اعمال سے بچنا چاہئے اور احکامِ خداوندی کی تعمیل میں تکاسل و تہاون سے کام نہ لینا چاہئے۔

بعض لوگوں نے اس مفہوم کو اس طرح بیان کیا ہے کہ قرآن مجید میں جو چیز بیان کی گئی اور صحیح سنت میں جس کی تعیین کی گئی ہے اس کو ظاہر کر دینا تفسیر ہے۔ کسی شخص کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے اجتہاد سے ان میں کوئی جدت پیدا کرے ورنہ وہ تفسیر بالرائے ہو جائیگی۔ جس کی ممانعت کی گئی ہے اور تاویل ان احکام کو کہتے ہیں جن کا استنباط وہ علما کرتے ہیں جو خطاب کے نشیب و فراز سے پوری طرح باخبر ہیں۔ اور جو علوم و فنون میں مہارتِ تامہ رکھتے ہیں۔ علامہ بغوی وغیرہ نے تاویل کی تعریف یہ کی ہے۔

التاویل صرف الآیۃ الی معنیً	تاویل آیت کا لوٹا دینا ہے ایک ایسے معنی کی
موافق لما قبلھا و ما بعدھا تحتملہ	طرف جو ما قبل اور مابعد کے موافق ہو اور وہ
الآیۃ غیر مخالف الکتاب و السنۃ	معنی قرآن و سنت کے مخالف نہ ہو اور لیے

من طریق الاستنباط [1]　　معانی پیدا کرنا از راہ استنباط ہوگا۔

سطور بالا میں تفسیر و تاویل سے متعلق جو اقوال نقل کئے گئے ہیں، ان سے یہ واضح ہوا ہوگا کہ تفسیر کا دارومدار بڑی حد تک علمِ لغت، معانی اور ادب پر ہے مگر تاویل یعنی قرآن مجید کی آیت کا صحیح مصداق متعین کرنے کے لئے صرف ان ہی علوم کی ضرورت نہیں بلکہ ضروری ہے کہ تاویل کرنے والا شریعت کے اسرار و حِکَم، رموز و غوامض اور اس کے احکام و مسائل سے پوری طرح واقف ہو اور استنباطِ مسائل کے جو اصول ہیں ان میں مہارت و کمال کا مرتبہ رکھتا ہو۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ شعراءِ فارس اپنے کلام میں تصوف کے مضامین کثرت سے بیان کرتے ہیں۔ لیکن بقول مرزا غالب

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو　　بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

یہ شعراءِ متصوفین شراب بولتے ہیں اور اس سے شرابِ معرفت، ساقی سے مرشدِ کامل اور شاہد سے شاہدِ حقیقی مراد لیتے ہیں، اس بنا پر جو شخص فارسی شاعری کی تاریخ، اس کی عہد بعہد ترقی اور شعراء کے اسالیبِ کلام سے واقف ہوگا اس کو شاعر کی صحیح مراد سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آئیگی اس کے برخلاف وہ شخص جو ان اسالیب سے واقف نہیں اور صرف زبانِ فارسی جانتا ہے وہ اشعار کا مطلب وہی سمجھے گا جو ان کے ظاہری و لغوی معانی سے مفہوم ہوتا ہے۔ بس اسی طرح درحقیقت تاویل کا اہل وہی شخص ہے جو شریعتِ اسلام کے تمام سرچشموں سے باخبر ہے اس کے بغیر اگر کوئی فہمِ قرآن کا ادعاء کرتا ہے تو اس کا لغزشوں اور ٹھوکروں سے بچا رہنا نہایت مشکوک ہے۔ قرآن مجید میں ایک آیت ہے:۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ　　وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے اپنے
بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ　　ایمان کو ظلم سے آلودہ نہیں کیا، ان ہی کے
مُّهْتَدُوْنَ۔ (الانعام)　　لئے امن ہے اور وہ سیدھے راستہ پر ہیں۔

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن ج ۲ ص ۱۷۳۔

اس آیت میں جو لفظ "ظلم" آیا ہے اس سے اگر لغوی معنی مراد لئے جائیں یعنی وضع الشئ فی غیر محلہ تو ہر گناہ صغیرہ و کبیرہ اس کے ماتحت داخل ہو جاتا ہے اور سوائے انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے کون ہے جس نے ایک مرتبہ بھی کسی گناہ کا ارتکاب نہ کیا ہو تو اب اشکال پیش آتا ہے کہ پھر اس آیت کا مصداق کون لوگ ہیں؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ظلم کے معنی لغوی مراد نہیں ہیں۔ اب لامحالہ ظلم کے معنی کی تعیین کرنے کے لئے آپ خود قرآن یا سنت کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہیں۔ چنانچہ ایک روایت ملتی ہے کہ صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت نے اس آیت کو سن کر سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم میں سے کون ہے جس نے اپنے نفس پر ظلم نہ کیا ہو؟ آپ نے فرمایا یہاں ظلم سے مراد "شرک" ہے۔

ہم اپنی بحث کے اس حصہ کو حضرت شاہ ولی اللہؒ کی ایک عبارت پر ختم کرتے ہیں جس میں پوری بحث کا خلاصہ بڑے اختصار اور جامعیت کے ساتھ آگیا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

> "قرآن عربی زبان میں براہ راست نازل ہوا۔ اہل عرب اپنے خداداد سلیقے کے مطابق منطوق کلام کو سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں کرتے تھے جیسا کہ خود قرآن مجید میں ارشاد ہے "والکتٰب المبین" کھلی اور واضح کتاب" ایک اور جگہ ارشاد ہے" قرآناً عربیاً لعلکم تعقلون" ایک مقام پر ہے "اُحکمت اٰیاتہ ثم فصلت" یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کی آیات کے معانی و مطالب کے سلسلہ میں صحابہ کرامؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت کم سوال کرتے تھے لیکن جب یہ طبقہ ختم ہو گیا اور عجم کا عمل دخل بڑھا۔ وہ پہلی زبان (خالص عربیت) متروک ہو گئی تو قرآن مجید کے بعض مقامات کا سمجھنا اور ان کا حل کرنا دشوار معلوم ہونے لگا۔ اب علم نحو اور لغت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ سوالات جوابات کی نوبت آئی اور تفسیر میں کتابیں لکھی جانے لگیں"

اس کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید کے فہم میں کن کن وجوہ و اسباب کی بنا پر وقت و دشواری یا غلطی پیدا ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں آپ لکھتے ہیں:-

"قرآن مجید کے کسی لفظ کی مراد تک نہ پہنچ سکنے کے چند وجوہ ہوتے ہیں مثلاً (۱) کبھی نادر الاستعمال لفظ کا استعمال۔ اس کا علاج یہ ہے کہ صحابہ اور تابعین اور دوسرے ارباب معانی سے رجوع کرکے اس لفظ کے معنی معلوم کئے جائیں (۲) منسوخ اور ناسخ میں امتیاز نہ کرنا (۳) اسبابِ نزول کا یاد نہ رکھنا (۴) مضاف یا موصوف کے محذوف ہونے کے باعث (۵) ایک چیز کا کسی دوسری چیز کے ساتھ یا ایک حرف کا کسی دوسرے حرف کے ساتھ۔ ایک اسم کا دوسرے اسم، ایک فعل کا کسی دوسرے فعل کے ساتھ بدل جانا۔ یا جمع کی جگہ مفرد، مفرد کی جگہ جمع کا رکھا جانا غائب کی جگہ مخاطب۔ یا اس کے برعکس ہونا کبھی تقدیم ما حقہ التاخیر اور تاخیر ما حقہ التقدیم انتشار ضمائر، ایک لفظ سے متعدد معانی کا مراد لیا جانا (۶) کبھی قرآن مجید کے فہم میں دشواری کا باعث تکرارِ مضمون۔ اطناب یا اختصار و ایجاز ہوتا ہے۔ (۷) کبھی کنایہ، تعریض، متشابہ اور مجاز عقلی اس صعوبتِ فہم کا باعث ہوتا ہے[1]"

بہرحال اس بحث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ قرآن مجید کی فہم کا مرحلہ صرف لغت ادب اور معانی و بیان کی روشنی میں کسی آیت کے مفہوم سمجھ لینے پر ہی ختم نہیں ہوجاتا بلکہ اس کی حقیقی مراد و مصداق کو متعین کرنے کے لئے سخت ضرورت ہے کہ فہم قرآن کا طالب شریعتِ اسلام کے اصل سرچشموں سے کما حقہ واقف ہو، اور ان میں بصیرانہ نگاہ رکھتا ہو، اس واقفیت کے بغیر قرآن مجید کو سمجھنے کی سعی کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی شخص امراء القیس کے اشعار عہدِ جاہلیت کی تاریخ معاشرت، تہذیب و تمدن، روایات، مزعومات و توہمات کو جانے پہچانے بغیر سمجھنا چاہیے۔

کیا قرآن مجید بغیر سنت کے صحیح معنی میں سمجھ میں آسکتا ہے؟

ہندوستان میں اب ایسے حضرات کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے جو مطالبِ قرآنی کے صحیح فہم کے لئے احادیث کے علم کو شرط قرار نہیں دیتے۔ ان کی رائے میں احادیث ناقابل اعتبار و استناد ہیں اور اس بنا پر ان میں یہ صلاحیت

---

[1] الفوز الکبیر ص ۵۱

ہی نہیں کہ تشریع احکام یا تفسیر قرآن میں ان سے مدد لی جا سکے۔ اس وجہ سے ضرورت ہے کہ اس خاص مسئلہ پر کسی قدر وضاحت کے ساتھ کلام کیا جائے۔

سنت سے احتجاج کا انکار ہمارے دورِ نامسعود کی ہی خصوصیت نہیں بلکہ اس سے قبل بھی کچھ لوگ تھے جو سنت کو قابلِ احتجاج تسلیم نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ علامہ ابن حزم اندلسی نے اپنی کتاب الاحکام الاحکام میں فتنۂ انکار حدیث کا ذکر کر کے لکھا ہے[1] کہ دنیا میں اس سے بڑھکر کوئی اور فتنہ نہیں ہو سکتا کہ آدمی قرآن مجید کو کتابِ الٰہی مانے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا بھی قائل ہو لیکن اس کے باوجود وہ احادیث واخبار کی حجیت سے انکار کرے۔

علامہ جلال الدین سیوطی نے نویں صدی ہجری کے آخر میں "مفتاح الجنۃ فی الاحتجاج بالسنۃ" نامی کتاب اسی طرح کے ایک منکرِ حدیث کے رد میں تصنیف فرمائی تھی جو مصر سے شائع ہو چکی ہے۔ لیکن زمانہ کے اوصاف واطوار کے اختلاف کی وجہ سے ہمارے عہد میں اور اس عہد میں فرق یہ ہے کہ زمانۂ گذشتہ میں چونکہ ایمان کامل اور عقائد پختہ اور تمسک بالشریعت کا جذبہ مستحکم تھا، اس لئے منکرِ حدیث پر گوشۂ عافیت تنگ ہو جاتا تھا۔ اس کی آواز صدا بصحرا ہو کر گمنامی وعدمِ قبول کی فضاؤں میں گم ہو جاتی تھی اور عام مسلمانوں میں اس کو نفرت وحقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ لیکن آج ایک شخص کھڑا ہو کر ڈنکے کی چوٹ احادیث نبوی کا انکار کرتا ہے، ان کی تشریعی واحکامی حیثیت کو تسلیم نہیں کرتا اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ معاذ اللہ کتبِ حدیث کو "جھوٹ کا سمندر دریا" کہتا ہے، ان کا استہزاء اور تمسخر کرتا ہے۔ سگرٹ کے پف ہوا میں اڑاتے اور اپنے ہونٹوں کو ایک اعوجاجی جنبش دیتے ہوئے ان پھبتیاں کستا ہے اس کے باوجود اس کو لوگ عزت واحترام کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اس کے مضامین کو رسالوں میں جگہ دی جاتی ہے اور اس کو "مجددِ ملت" "مفتیِ شریعت" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

"وائے گر در پسِ امروز بود فردائے"

---

[1] احکام الاحکام ج ۱ ص ۱۰۲۔

دین میں مداہنت اور شریعت کی پابندیوں میں تساہل برتنے والی طبیعتیں اس کی آواز پر لبیک کہتی ہیں۔ اور اس طرح وہ چند برگشتہ دماغ نوجوانوں کا ایک حلقہ تیار کر لیتا ہے۔

قرآن میں اتباع رسول کا حکم

ان حضرات سے خود ان کے عقیدہ کے مطابق پہلی بات یہ دریافت کرنی چاہیے کہ قرآن مجید کو تو آپ قابلِ استناد اور اس کے احکام کو واجب الاتباع مانتے ہی ہیں۔ اب یہ ارشاد ہو کہ اس باب میں قرآن کا ایک ایک لفظ ایک ایک آیت سب برابر ہیں یا ان میں کوئی فرق ہے۔ نیز یہ کہ قرآن مجید میں جو اوامر و احکام ارشاد فرمائے گئے ہیں، ان میں کیا بعض احکام ایسے بھی ہیں جن کا مصداق خارج میں موجود نہیں؟ اگر یہ فرمایا جائے کہ قرآن کی تمام آیات کا خارج میں مصداق موجود ہے اور وہ سب ہمارے لئے ضروری الاتباع ہیں تو پھر اُن آیات کی نسبت کیا کہا جائیگا جن میں صاف طور سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلنے اور آپ کے اقوال و افعال پر عمل کرنے کا امر فرمایا گیا ہے۔ مثلاً آیات ذیل

(۱) فَآمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهٖ — ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر۔

(۲) إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهٖ — مومن صرف وہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ایمان بالرسول کے معنی کیا صرف یہ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت کا اقرار کر لیا جائے اور آپ کے اقوال و افعال سے کوئی سروکار نہ رکھا جائے اگر ایمان بالرسول کے معنی صرف یہی ہیں تو ایمان باللہ کے معنی بھی یہی ہونے چاہئیں کہ اللہ کی وحدت اور اس کی ربوبیت کا اقرار کر لیا جائے اور اس کے اوامر و نواہی کی پروا نہ کی جائے ظاہر ہے کہ جس شخص کو اسلام کے ساتھ دور کا بھی لگاؤ ہے وہ ایمان باللہ و بالرسول کے یہ معنی ہرگز مراد نہیں لے سکتا بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ اللہ کو واحد و رب مطلق اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی برحق یقین کر کے دونوں کے اوامر و نواہی پر عمل پیرا ہونے کا عہد و پیمان کرتا ہے۔ ورنہ اگر ایمان بالرسول سے مراد صرف آپ کی نبوت و رسالت پر ایمان لانا ہو تو

آپ کی حیثیت محض ایک ایلچی اور پیغامبر کی رہ جاتی ہے حالانکہ خود قرآن مجید نے متعدد مواقع پر اس کی صاف تصریح کر دی ہے کہ آپ صرف ایلچی نہیں بلکہ قرآن کی مراد کو بیان کرنے والے اور اس کے شارح ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَمَا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ — اور ہم نے آپ پر کتاب نہیں نازل کی مگر اس لئے
إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي — کہ آپ ان لوگوں کے سامنے مراد بیان کر دیں
اخْتَلَفُوا فِيهِ۔ — جو اس میں اختلاف کر رہے ہیں۔

اس آیت میں فیہ کی ضمیر مجرور کتاب یعنی قرآن کی طرف راجع ہے۔ اس سے مطلب یہ ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن محض اسی لئے نازل کیا گیا ہے کہ جب قرآن کے کسی لفظ کے معنی یا حکم میں کچھ لوگ باہم اختلاف کریں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی مراد بیان فرما کر اس اختلاف کا خاتمہ کر دیں یہ منصب آپ کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔

پھر ایک مقام پر فرمایا گیا ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى — اور جب اللہ اور اس کا رسول کسی امر کا حکم
اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ — فرما دیں تو اب کسی مومن مرد اور عورت کو اپنے
الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۗ وَمَن — معاملہ میں کوئی اختیار باقی نہیں رہتا اور جو
يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ — شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا
ضَلَالًا مُّبِينًا۔ — ہے وہ کھلا ہوا گمراہ ہے۔

دیکھئے! اس آیت میں جس طرح اللہ کے امر کو واجب الاطاعت اور اس سے سرتابی کو کھلی ہوئی گمراہی قرار دیا گیا ہے ٹھیک اسی طرح امر رسول کو بھی واجب الاطاعت اور اس کی عدول حکمی کو ضلال مبین فرمایا گیا ہے۔ پس اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت محض ایک ایلچی کی ہوتی تو ورسولہ کہنے کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی اور نہ اللہ کی نافرمانی کے ساتھ رسول کی نافرمانی کا ذکر کر کے اس کو کھلی ہوئی گمراہی کہا جاتا۔ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ قرآن مجید عمل کرنا ہی اللہ اور

اس کے رسول پر ایمان لانا ہے تو معلوم نہیں اس آیت کا کیا جواب دیا جائے گا جس میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر احسان جتاتے ہوئے صاف طور پر فرما دیا ہے کہ رسول اللہ تمہارے پاس کتاب (قرآن مجید) اور حکمت لیکر آئے ہیں۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ	اللہ نے مومنوں پر بڑا احسان کیا کہ اس نے
بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ	خود ان ہی میں سے ایک رسول پیدا کیا جو ان پر
يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ	اللہ کی آیات کی تلاوت کرتا ہے ان کا تزکیہ کرتا
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ	ہے ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اگرچہ
كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ	وہ پہلے سے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

یہ "حکمت" کیا بعینہ کتاب ہے؟ اور کیا "حکمت" کا عطف کتاب پر عطف بیان ہی ہے؟ ارباب بلاغت جانتے ہیں کہ یہاں موقع عطفِ بیان کا ہے ہی نہیں، کیونکہ یہاں احسان جتایا جا رہا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد اوصاف کو بیان کرنا مقصود ہے اگر کتاب اور حکمت سے ایک ہی چیز مراد لی جائے تو آنحضرت کے اوصاف میں ایک کی کمی ہو جاتی ہے چنانچہ امام شافعی فرماتے ہیں "میں نے ان بزرگ سے جو اہلِ علم میں مجھ کو سب سے زیادہ محبوب ہیں سنا ہے کہ اس آیت میں کتاب سے مراد قرآن مجید اور حکمت سے مراد سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے" پس اگر حکمت سے مراد غیر کتاب اللہ کوئی دوسری چیز ہے اور از روئے بلاغت حکمت کو کتاب اللہ مراد ہو ہی نہیں سکتی تو بتایا جائے وہ کہاں ہے اور کیا ہے؟ اور کیا وہ اقوال و افعال نبوی کے سوا کوئی دوسری چیز ہو سکتی ہے؟

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ	اے ایمان والو تم اطاعت کرو اللہ کی اور
وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ	اطاعت کرو اس کے رسول کی اور اپنے اولی الامر
مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ	کی۔ اور اگر کسی بات میں جھگڑ بیٹھو تو اس کو اللہ
اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ۔ (النساء)	اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو۔

اس آیت میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے لئے الگ الگ صیغہ "اطیعوا" لایا گیا ہے لیکن "اولی الامر" کے لئے الگ کوئی صیغہ نہیں لایا گیا بلکہ اس کو صرف "رسول" پر معطوف کر دیا گیا ہے۔ اس میں خاص نکتہ ہے؟ ہو سکتا تھا کہ صرف ایک "اطیعوا" بصیغۂ امر لایا جاتا اور رسول اور اولی الامر دونوں کو اللہ پر معطوف کر دیا جاتا۔ اسی طرح یہ بھی ممکن تھا کہ تینوں کے لئے الگ الگ تین صیغے "اطیعوا" کے لائے جاتے۔ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ ان دونوں صورتوں میں سے کسی ایک کو اختیار نہیں فرمایا گیا اور اللہ اور اس کے رسول کے لئے تو جدا جدا "اطیعوا" ارشاد ہوا "اولی الامر" کے لئے نہیں۔ اس میں نکتۂ بلیغ یہ ہے کہ قرآن مجید کو اصل میں دو مجموعۂ قوانین کی طرف اشارہ کرنا ہے ایک وہ جو اللہ کی طرف منسوب ہو کر "کتاب اللہ" اور دوسرا وہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب ہو کر سنت رسول اللہ کہلاتا ہے اور چونکہ اولی الامر (ان سے مراد حکام وولاۃ ہوں یا علماء و مجتہدین) کی اطاعت کے لئے الگ کوئی مجموعۂ قوانین نہیں ہے بلکہ ان کی اطاعت کے احکام وہی ہیں جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے ماخوذ ہیں اس بنا پر ان کے لئے الگ صیغہ "اطیعوا" نہیں فرمایا گیا چنانچہ آیت کا اخیر حصہ بھی اس پر دلالت کرتا ہے یعنی یہ کہ اگر تم آپس میں جھگڑا کرو (تم میں حاکم اور محکوم دونوں شامل ہیں) تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو، مطلب یہ ہے کہ ان سے فیصلہ طلب کرو۔

اس سے صاف معلوم ہوا کہ ہمارے لئے قابلِ احتجاج دو چیزیں ہیں، ایک اللہ کا فرمان اور دوسرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد، اگر صرف اللہ کا فرمان یعنی وحی متلو ہی لائق استناد ہوتا تو "الی الرسول" فرمانے کی کیا وجہ ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ درحقیقت رسول کا فرمان بھی اللہ کا ہی فرمان ہے تب بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ اللہ کے ساتھ رسول کے ذکر کا سبب کیا ہے؟

اب ان آیتوں پر غور فرمائیے جن میں صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور آپ کے احکام و اوامر کی پیروی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى	تیرے رب کی قسم یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں
يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ	ہوں گے جب تک کہ اپنے اختلافات میں آپ کو
لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا	حکم نہیں بنائیں گے اور پھر اس کے بعد آپ کے حکم پر
مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا	شک و شبہ دل میں کوئی تنگی بھی محسوس نہیں کریں گے
(النساء)	اور پورے طور پر اس کو تسلیم نہیں کر لیں گے۔

بخاری میں حضرت عبد اللہ بن زبیر سے روایت ہے کہ ایک انصاری نے حضرت زبیر سے درخت کو سیراب کرنے کے لئے پانی کے معاملہ میں جھگڑا کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ معاملہ پیش ہوا تو آپ نے حضرت زبیرؓ سے فرمایا "تم اپنی زمین کو سیراب کر لو، اور اس کے بعد پانی اپنے پڑوسی کے لئے چھوڑ دو، اس پر انصاری بولا "زبیر آپ کے پھوپی زاد بھائی ہیں نا" یہ سن کر سرور کائنات کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور آپ نے فرمایا "اے زبیر! تم زمین کو سیراب کرو پھر پانی روک دو، یہاں تک کہ وہ دیواروں پر چڑھ جائے۔ زبیرؓ نے فرمایا میں گمان کرتا ہوں کہ یہ آیت فلا وربک لا یؤمنون الآیۃ اسی واقعہ کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے۔[2]

---

[1] بخاری کتاب التفسیر سورۃ النساء۔ [2] اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ ایک مقام پر تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست اقدس پر بیعت کرنے کو بعینہٖ خدا کے ہاتھ پر بیعت کرنا ہی قرار دیا گیا ہے اور جو لوگ بیعت کرنے کے بعد نقض عہد کریں ان کے لئے وعید شدید اور بیعت کے مطابق عمل کرنے والوں کے لئے اجر عظیم کا وعدہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ	بے شبہ وہ لوگ جو آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ
اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ فَمَنْ	خدا سے بیعت کرتے ہیں اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں
نَكَثَ فَإِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهِ وَمَنْ	پر ہے پھر جو شخص قول توڑتا ہے وہ اپنے نقصان
أَوْفٰى بِمَا عَاهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيهِ	کیلئے ہی توڑتا ہے اور جو اس چیز کو پورا کرتا ہے
أَجْرًا عَظِيمًا۔ (فتح)	جس کا اس نے اللہ سے اقرار کیا ہو تو اللہ اس کو اجر عظیم دیگا

ان آیات سے یہ امر بالکل صاف ہوجاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی پر عمل کرنا ایسا ہی ضروری ہے جیسا کہ قرآن پر لیکن فرق یہ ہے کہ قرآن نقلِ متواتر کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے۔ اس بنا پر وہ قطعی الثبوت ہے۔ اور احادیث کا حال یہ نہیں ہے ان میں بہت کم ایسی حدیثیں ہیں جن کو متواتر کہا جاتا ہے۔ پس یہ فرق محض نقل کی قوت وضعف کی وجہ سے ہے ورنہ اگر کسی حدیث کی نسبت کسی ذریعہ سے بالکل قطعی طور پر یہ ثابت ہوجائے کہ وہ بعینہٖ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے تو وجوبِ عمل کے اعتبار سے اس میں اور قرآن کی آیت میں کوئی فرق نہیں ہوگا کیونکہ خود قرآن آپ کے متعلق شاہد ہے۔ وما ینطق عن الھوٰی۔ ان ھو الا وحیٌ یوحیٰ۔

حدیث کی تشریعی حیثیت ان آیات کا مطالعہ غور سے کرو اور دیکھو کہ منکرینِ حدیث میں سے جو لوگ حدیث کی تاریخی حیثیت کو تو تسلیم کرتے ہیں لیکن اس کو تشریعِ احکام میں موثر نہیں ماننے انھیں بتانا چاہیے کہ اگر سنت کی حیثیت محض تاریخی ہے تشریعی نہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تحکیم اور آپ کے فیصلہ کا واجب الاطاعۃ ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ آخر آیت میں کس تاکید سے فرمایا گیا ہے کہ "تیرے رب کی قسم یہ مومن ہی نہیں ہوں گے جب تک کہ آپ کے فیصلہ کو بغیر کسی بددلی کے پورے طور پر تسلیم نہیں کرلیں گے۔"

اب دریافت طلب یہ ہے کہ یہ حکم آج بھی موجود ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے اور صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ تک کے لئے تھا تو چونکہ آپ کی حیات میں وحی برابر نازل ہوتی رہتی تھی اور جو بات اہم پیش آتی تھی اس کا جواب قرآن سے مل جاتا تھا اس لئے اس کی ضرورت ہی نہ تھی کہ آپ کو حکم بنانے اور آپ کے ارشادِ سامی کو تسلیم کرنے کا حکم دیا جاتا۔ لامحالہ یہ ماننا پڑیگا کہ "ردوہ الی اللہ والرسول" اور آنحضرتؐ کے فیصلہ کو بے چون وچرا تسلیم کرنے کا حکم آج بھی ایسا ہی موجود ہے جیسا کہ آپ کے عہد میں تھا

اب سوال یہ ہے کہ اگر سنت کا تمام ذخیرہ (معاذ اللہ) ناقابلِ احتجاج ہے تو پھر قصار

رسولؐ کو ادنیٰ پس و پیش کے بغیر تسلیم کرنے اور اس پر عمل کرنے کی صورت کیا ہے؟ اور نزاع برپا ہونے کے وقت ردالی اللہ کے ساتھ رد الی الرسول کیونکر ممکن ہے؟

پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ علامہ ابن قیم کے بقول 'سنت' کا تعلق قرآن کے ساتھ تین طرح کا ہے۔ ایک یہ کہ سنت قرآن کے ساتھ پورے طور پر موافق ہو تو اب اس صورت میں قرآن اور سنت کا ایک حکم پر توارد ایسا ہی ہے جیسا کہ مختلف دلیلوں کا کسی ایک مدعا کے لئے جمع ہو جانا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ سنت میں اس چیز کا بیان ہو جو قرآن میں مذکور ہے اور اس کی تفسیر ہو۔ تیسری صورت یہ ہے کہ قرآن مجید جس حکم کے ایجاب یا تحریم سے خاموش رہا ہو، اس کو سنت میں واجب یا حرام قرار دیا گیا ہو۔

علامہ ابن قیم ان تینوں صورتوں کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ سنت ان تین اقسام سے خارج نہیں ہے۔ اس بنا پر اس کو قرآن کے ساتھ کسی قسم کا تعارض نہیں۔ پس جو سنت قرآن پر کسی طرح بھی زائد ہوگی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایک مستقل تشریع ہے۔ اور اس کی اطاعت واجب اور معصیت حرام ہے اور اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ سنت کو کتاب اللہ پر تقدم حاصل ہے بلکہ آپ کے ارشادِ گرامی کی تعمیل تو بعینہ خدا کے فرمان کی بجا آوری ہے جو اس نے اپنے رسول کی اطاعت کے متعلق دیا ہے اور اگر اس قسم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت نہ کی جائے تو پھر آپ کی اطاعت کے کوئی معنی ہی نہیں رہتے اور جو طاعت حضورؐ کے ساتھ مختص ہے وہ کالعدم ہو جاتی ہے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت صرف احکامِ قرآنی میں ضروری قرار دی جائے اور جس حکمِ نبوی کے متعلق قرآن خاموش ہو، اس کی اطاعت ضروری نہ ہو تو مخصوص طاعت رسول باقی نہیں رہے گی۔[1] حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے من یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔

[1] اعلام الموقعین ج ۲ ص ۲۳۲۔

جو محققین و مجددین حدیث کو محض ایک تاریخی حیثیت دیتے ہیں انھیں آیتِ ذیل بار بار پڑھنی چاہیئے۔

لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ	تم رسول کے بلانے کو ایسا مت سمجھو جیسا کہ تم میں
كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا قَدْ يَعْلَمُ اللَّهُ	کا ایک دوسرے کو بلا لیتا ہے، بلا شبہ اللہ تعالیٰ
الَّذِينَ يَتَسَلَّلُونَ مِنْكُمْ لِوَاذًا	تم میں سے ان لوگوں کو جانتا ہے جو کترا کر نکل
فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ	جاتے ہیں وہ لوگ جو رسول کے امر سے اعراض
أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ	کرتے ہیں ان کو ڈرنا چاہیئے کہ کہیں انھیں کوئی
عَذَابٌ أَلِيمٌ۔	فتنہ یا عذاب الیم نہ پہنچ جائے۔

آپ نے دیکھا! اس آیت میں کس وضاحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ رسول اللہ کا ارشاد عام بات چیت یا عام ملفوظات کی طرح نہیں ہے کہ ان سے محض تاریخ کا کام لیا جائے بلکہ وہ واجب الاتباع ہے اور یخالفون کے صلہ میں "عن" واقع ہو رہا ہے۔ اس لئے معنی یہ ہوئے کہ جو لوگ امرِ رسول سے کترا کر نکل جاتے ہیں ان کو فتنہ یا شر پہنچنے کا اندیشہ ہے، کہاں حدیث کی محض تاریخی حیثیت اور کہاں یہ تاکید اکید۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا!

ایک دوسری آیت ہے۔

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ	اور اتاری ہم نے تجھ پر یہ یادداشت تاکہ تو کھول دے
لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ۔	لوگوں کے سامنے وہ چیز جو اتری ان کیلئے

یہاں "یادداشت" سے مراد قرآن مجید ہے جو امم سابقہ کے شرائع و احوال کا محافظ انبیائے سابقین کے علوم کا جامع اور احکامِ الٰہی اور فلاحِ دارین کے طریقوں کو یاد دلانے والا ہے۔ اس آیت کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے۔ حضور! آپ کا کام یہ ہے کہ تمام انسانوں کے لئے اس کتاب کے مضامین خوب کھول کھول کر بیان فرمائیں جو چیز قابلِ تشریح ہے اس کی تشریح فرمادیں جو

مجمل ہے اس تفصیل کر دیں۔ یہ آیت اس حقیقت پر دلیل قاطع ہے کہ آیاتِ قرآنی کا وہی مطلب قابلِ اعتبار ہے جو حضور کی بیان فرمودہ حدیثوں کے مطابق ہو۔

ان آیات بینات کے سوا ایک اور آیت ہے:۔

وَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ	جو چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو دیں اس کو
وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا۔	لے لو اور جس سے روکیں اس سے رک جاؤ۔

اس آیت میں دو باتیں لائق توجہ ہیں۔ اول یہ کہ اس میں ما فرمایا گیا ہے جو عام ہونے کے اعتبار سے ہر اس چیز کو شامل ہے جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم تم کو دیں خواہ وہ قرآن مجید ہو یا ارشاداتِ نبوی۔ ہمارا فرض ہے کہ اس کو قبول کر لیں اور پھر جس چیز سے آپ روکیں اس سے رک جائیں۔

ایتاء اور نہی کی اسناد مجازی ہے یا حقیقی

دوسری بات یہ ہے کہ "اتی" اور "نہی" ان دونوں فعلوں کی اسناد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہو رہی ہے۔ اب گفتگو یہ ہو سکتی ہے کہ اسناد حقیقی ہے یا مجازی، اسناد مجازی کی صورت یہ ہوگی کہ دراصل ایتاء اور نہی کا فاعل یا تلقوالہ

---

[1] اس آیت کی وجہ سے بعض صحابہ تو فرمانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی کتاب اللہ کا اطلاق جائز کر دیتے تھے۔ بخاری میں حضرت عبد اللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے ہاتھوں کے گودنے اور گدوانے والی، اور بالوں کو نوچنے والی اور حسن کو نمایاں کرنے والی اور قدرتی پیدائش کی وضع کو بدلنے والی عورتوں پر لعنت بھیجی۔ ایک عورت ام یعقوب کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ آئی اور کہنے لگی "مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ آپ نے اس اس طرح لعنت بھیجی ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا "میں کیوں اس شخص پر لعنت نہ بھیجوں جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملعون کیا ہو اور پھر وہ کتاب اللہ میں بھی ہو" عورت کہنے لگی "میں نے پورا قرآن پڑھا ہے لیکن مجھ کو تو کہیں پر لعنت کا حکم ملا نہیں۔ آپ نے فرمایا "اگر تم نے قرآن پڑھا ہوتا تو ضرور مل جاتا۔ کیا تم نے آیت وما آتاکم الرسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا" پڑھی ہے؟ ام یعقوب بولی ہاں! یہ آیت تو پڑھی ہے۔ ابن مسعودؓ نے فرمایا "تو پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کی نمود و نمائش اور زیبائش و آرائش سے منع فرمایا ہے (بخاری کتاب التفسیر سورۃ الحشر)۔

تو ہے خداوند تعالیٰ کی طرف لیکن مجازِ عقلی کے متعدد علاقوں میں سے کسی ایک علاقہ کے متحقق ہونے کی وجہ سے فعل کی اسناد بجائے اللہ کے رسول کی طرف کردی گئی ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ یہاں اسناد حقیقی ہے اور اسناد مجازی ماننے کے لئے کوئی قوی وجہ موجود نہیں ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ اس قسم کے موقع پر اگر کوئی بات بڑھا چڑھا کر پُر عظمت طریقہ سے بیان کرنی منظور ہوتی ہے تو وہاں اسنادِ مجازی سے کام لیا جاتا ہے مثلاً آپ اگر جامع مسجد دہلی کی عظمت بیان کرنا چاہتے ہیں تو کہیں گے "یہ مسجد شاہ جہاں بادشاہ نے بنائی ہے" پس اگر آیت بالا میں واقعی ایتاء اور نہی کا فاعل اللہ تعالیٰ ہوتا تو اس سے عدول کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی بلکہ حکم کی عظمت اور اس کے قبول کرنے کو تاکید بیان کرنے کا مقتضیٰ یہ تھا کہ بجائے رسول کے اللہ کو ہی فاعل بنایا جاتا۔ کیونکہ اللہ کا حکم "بہرحال" رسول کے حکم سے زیادہ عظمت رکھتا ہے لیکن ایسا نہیں کیا گیا بلکہ رسول اللہ کو دونوں فعلوں کا فاعل بنایا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ درحقیقت اتی اور نہی کی اسناد اسناد حقیقی ہے مجازی نہیں۔ اس بنا پر اب آیت کے صاف معنی یہ ہوگئے کہ رسول اللہ بذات خود جو چیز تم کو دیں اس کو قبول کرو اور جس سے روکیں اس سے رک جاؤ۔[۱]

---

[۱] حضرت ابو رافعؓ کی ایک روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں تم میں سے کسی کو نہ پاؤں جو اپنے تخت پر تکیہ لگائے بیٹھا ہو اور جب اس کے پاس کوئی ایسا حکم آئے جو میں نے کسی کام کے کرنے کا امر یا نہ کرنے کی نہی کی ہو تو وہ کہے کہ میں اسے نہیں جانتا میں تو وہی جانتا ہوں جس کو کتاب اللہ نے بیان کیا ہو (ابوداؤد) جامع ترمذی میں مقدام بن معدی کرب کی حدیث ہے کہ کوئی شخص یہ نہ کہے کہ میں تو صرف کتاب اللہ کے حلال و حرام کو ہی جانتا ہوں۔ خبردار ہو کہ میں کو رسول اللہ نے حرام کیا ہے وہ اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کی طرح ہے۔ ان روایات میں حمار اہلی (گدھے) درندوں اور لقطہ معاہد کی حرمت کا ذکر ہے جیسے ہم آگے تفصیل سے بیان کریں گے۔ انہی احادیث کے بعض طرق میں یہ الفاظ بھی ہیں الا من بلغہ عنی حدیث فکذب بہ فقد کذب اللہ ورسولہ والذی حدثہ یعنی اچھی طرح سن لو کہ جس کے پاس میری حدیث پہنچے اور اس کے باوجود اسے جھٹلائے تو حقیقت میں اس نے اللہ تعالیٰ کو، اللہ تعالیٰ کے رسول کو اور اس کو جھٹلایا جس نے اس سے یہ حدیث بیان کی (مجمع الزوائد للہیثمی)

خلاصہ یہ ہے کہ یہاور اسی طرح کی متعدد آیات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کے احکام کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی اطاعت ضروری ہے۔ اب بحث یہ ہے کہ قرآن مجید کی یہ آیات قطعی الثبوت اور قطعی الحکم ہیں یا نہیں؟ اگر ہیں تو ان کا خارج میں کوئی مصداق موجود ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو وہ کیا ہے؟ اور کیا وہ سنت کے علاوہ کوئی اور چیز بھی ہے؟

یہاں تک جو گفتگو تھی وہ قرآن مجید کی ان چند آیات کے پیش نظر تھی جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع اور آپ کے ارشاداتِ گرامی پر عمل پیرا ہونے کا حکم تھا۔ اب آئیے یہ دیکھیں کہ قرآن مجید حقیقی طور پر "سنت" کے بغیر سمجھ میں آبھی سکتا ہے یا نہیں اور اس کا صحیح مفہوم و مطلب بغیر سنت کے متعین ہو بھی سکتا ہے یا نہیں؟

آیاتِ قرآنی کا صحیح مفہوم سنت کے بغیر متعین نہیں ہو سکتا

اصل یہ ہے کہ اگر قرآن کو سمجھنے کی کوشش میں سنت سے کوئی سروکار نہ رکھا جائے تو قرآن مبہم اوامر و نواہی اور قصص کا ایک مجموعہ ہو کر رہ جائے گا۔ اور اسلام کے مکمل و مفصل دستور اساسی ہونے کی حیثیت بڑی حد تک باطل ہو جائیگی مثلاً "اقیموا الصلوٰۃ" کے معنی و مصداق کی تحقیق میں اگر سنت سے مدد نہ لی جائے تو اس حکم کی تعمیل میں عجیب قسم کا انتشار نظر آئے گا۔ صلوٰۃ کے لغوی معنی دعا، یا عبادت گاہ ہیں۔ پس کوئی صاحب تو اس حکم کی تعمیل محض دعا کریں گے اور اس کے لئے بھی کوئی خاص شکل اور کوئی خاص وقت نہیں ہوگا۔ وارکعوا مع الراکعین کے امر کی تعمیل میں بھی اسی طرح بڑبونگ نظر آئے گی۔ رکوع کے معنی لغۃً مطلق انحناء (جھکنا) ہیں۔ اب اگر رکوع کو اس کی حقیقت شرعیہ (جس کا ثبوت صرف سنت سے ملتا ہے) سے الگ کر لیا جائے تو یہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ وارکعوا مع الراکعین کے معنی کیا ہیں؟ اور اس کا مقصد کیا ہے۔ ایک صلوٰۃ و رکوع پر کیا موقوف ہے، زکوٰۃ، حج، اوقات و ارکان صلوٰۃ، ربٰو وغیرہ کسی کی صحیح حقیقت سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اور پورے قرآن کو پڑھنے کے بعد بھی عبادات و معاملات کا کوئی مکمل جامع نقشہ مرتب نہیں ہو سکتا۔

حضرت عمران بن حصینؓ کا استدلال

امام بیہقیؒ نے اپنی سند سے شبیب بن فضالۃ المکی سے بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ عمران بن حصینؓ نے چند لوگوں کے سامنے شفاعت کا بیان کیا ایک شخص بولا: اے ابو نجید تم ہمارے سامنے وہ حدیثیں بیان کرتے ہو جن کی اصل ہم کو قرآن میں نہیں ملتی عمران یہ سنکر غضبناک ہو گئے اور آپ نے اس شخص سے فرمایا: تم نے قرآن پڑھا ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ فرمایا: کیا تم نے قرآن میں کہیں یہ پڑھا ہے کہ عشاء کی فرض رکعتیں چار، مغرب کی تین، فجر کی دو، ظہر اور عصر کی چار چار ہیں؟ بولا: نہیں۔ حضرت عمران بن حصینؓ نے فرمایا: کیا ان سب رکعتوں کا علم تم نے ہم سے حاصل نہیں کیا۔ اور کیا ہم نے ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سیکھا ہے؟ پھر عمران بن حصین نے سوال کیا: کیا تمہیں قرآن میں کوئی ایسی آیت ملی ہے جس میں بتایا گیا ہو کہ چالیس بکریوں میں ایک بکری زکوٰۃ کی، اور اتنے اونٹوں میں ایک اونٹ اور اتنے دراہم میں ایک درہم زکوٰۃ کا ادا کرنا ہوگا۔ اس شخص نے کہا: نہیں۔ آپ بولے: کیا زکوٰۃ کی ان تمام مقادیر اور نصاب کا علم تم نے ہم سے اور ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سیکھا ہے؟ اس کے بعد عمران نے فرمایا: قرآن مجید میں ہے ولیطوفوا بالبیت العتیق تو کیا قرآن نے تم کو یہ بھی بتایا ہے کہ سات طواف کیا کرو اور اس سے فارغ ہو کر مقام ابراہیم کے پیچھے دو رکعت ادا کرو۔ پھر فرمایا کہ تم نے قرآن میں یہ بھی دیکھا ہے؟

لا جلب لا جنب لا شغار فی الاسلام (مشکوٰۃ شریف) اسلام میں نہ جلب ہے نہ جنب اور نہ شغار[1]

کیا تم نے سنا نہیں قرآن ہی خود کہتا ہے وما اتکم الرسول فخذوہ وما نھکم عنہ فانتھوا۔ اس تقریر کے بعد عمران بولے یہ اسلامی احکام (جو عبادات و معاملات سے متعلق ہیں) یہ سب کے سب ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لئے ہیں اور یہ وہ چیزیں ہیں جن کا تم کو علم نہیں

---

[1] زکوٰۃ کی اصطلاح میں جلب اور جنب یہ ہے کہ زکوٰۃ وصول کرنے والا زکوٰۃ کے مویشیوں سے دور خیمے لگا کر زکوٰۃ دینے والوں کو اپنے پاس مویشیوں اور زکوٰۃ کی رقم کے لئے مجبور کرے اور شغار کے معنی ہیں اپنی بیٹی کا دوسرے کے بیٹے سے اس شرط پر نکاح کرنا کہ وہ اپنی بیٹی اس کے بیٹے سے بیاہ دے۔ اسلام میں ان دونوں باتوں کی ممانعت ہے۔

یعنی قرآن مجید کی تلاوت کرنے کے باوجود۔[1]

سنت اور لغت اگر فہم قرآن میں سنت سے مدد نہ لی جائے تو اس سے نہ صرف یہ کہ منقولات شرعیہ (یعنی وہ الفاظ جو لغۃً کسی معنی میں مستعمل ہوئے تھے لیکن شریعت نے ان کے معانی مخصوص و متعین کر دیئے ہیں مثلاً صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج، اعتکاف، طواف وغیرہ) کو ہم نہیں سمجھ سکتے بلکہ لغت کی روشنی میں بھی بعض آیات کے مفہوم کو صحیح طور پر متعین نہیں کر سکتے۔[2]

یہی وجہ ہے کہ صحابہؓ کرام زباں داں اور عربی فصاحت و بلاغت سے پورے طور پر واقف ہونے کے باوجود بعض آیات کا مطلب نہیں سمجھتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرتے تھے۔ آیت حج وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا نازل ہوئی تو ایک صحابی نے دریافت کیا العامنا ھذا یا رسول اللہ یعنی یہ حکم اسی سال کے لئے ہے یا ہر سال کے لئے؟ اس پر آپ نے اس کی تشریح فرمائی کہ ایک شخص پر عمر بھر میں ایک مرتبہ حج کرنا فرض ہے۔ بشرطیکہ اس میں فرضیت حج کی شرائط پائی جائیں۔

تیمم سے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔

فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا اگر تم پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی سے تیمم کر لو۔

تو صحابہؓ کرام کو واضح طور پر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ تیمم صرف وضو کی ضرورت کے وقت کے لئے ہے یا غسل ضروری کے لئے بھی۔ چنانچہ ایک صحابی کو سفر میں غسل کی ضرورت پیش آ گئی اور وہاں پانی تھا نہیں انہوں نے اجتہاداً اپنے تمام بدن کا مٹی سے تیمم کر لیا۔ آنحضرت صلی اللہ

---

[1] مفتاح الجنۃ فی الاحتجاج بالسنۃ ص ۲۰۰۔ حکم بن ابان نے حضرت عکرمہؓ سے امہات الاولاد کے متعلق دریافت کیا عکرمہ نے فرمایا وہ آزاد ہیں۔ میں نے کہا کس حکم سے (یعنی حکم کہاں ہے) فرمایا قرآن سے۔ میں نے کہا قرآن کی کونسی آیت سے فرمایا یا ایہا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔

[2] علامہ شاطبیؒ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں۔ وتعلم بهذا ان بيان السنة هو مراد الله تعالى من تلك الصيغ فاذا طرحت واتبع ظاهر الصيغ بمجرد الهوى صار صاحب هذا النظر ضالا في نظره جاهلا بالكتاب خابطا في عمياء (الموافقات في اصول الشريعة ج ۴ ص ۳۰)۔

علیہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو فرمایا "جو تیمم وضو کا قائم مقام ہے وہی غسل کا بھی قائم مقام ہے"۔ اس طرح کی بہت سی آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کا صحیح مفہوم متعین نہ فرما دیتے تو صحابہ کرام میں سخت اختلاف پیدا ہو جاتا اور قطعی طور پر ان کے متعلق کوئی فیصلہ نہ ہو سکتا۔

بعض دفعہ کلام کی مراد بجز مخاطب کے کوئی دوسرا متعین نہیں کر سکتا

پھر یہ حقیقت بھی نظر انداز نہ کرنی چاہیے کہ بعض اوقات کسی کلام کا صحیح مفہوم صرف مخاطب کے ذریعہ ہی متعین ہو سکتا ہے، مثلاً فرض کیجئے آپ اپنے کسی بیمار دوست کی عیادت کے لئے گئے ہیں اور اس سے مزاج کی کیفیت دریافت کرتے ہیں تو وہ اکتائے ہوئے لہجے سے کہتا ہے "اچھا ہوں"! اس جملہ کا مطلب بظاہر یہی ہے کہ اب وہ تندرست ہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ بیمار دوست نے جو "اچھا ہوں" کہا تھا وہ کس لہجے کے ساتھ کہا تھا اور اس بنا پر اس کا مطلب وہ نہیں ہے جو اس کے الفاظ سے ظاہری طور پر مستفاد ہوتا ہے بلکہ دراصل مقصد یہ ہے کہ بیماری کو اتنا استداد ہو گیا ہے کہ اب میں اپنے مرض کے متعلق کیا کہوں، بس یہی کہنا چاہیے کہ اچھا ہوں۔

پس جب آپ روزمرہ کی گفتگو میں بعض جملوں کا مطلب ان کے ظاہر المعنی ہونے کے باوجود مخاطب کی امداد کے بغیر نہیں سمجھ سکتے تو قرآن مجید کو سنت سے الگ کر کے کس طرح سمجھ سکتے ہیں جبکہ یہ معلوم ہے کہ قرآن مجید تشریعِ احکام کی کتاب سماوی ہے اور اس کا نزول ایک خاص ماحول میں وقت کے پیش آمدہ مسائل کے جواب میں ایک خاص قسم کی نفسیات طبائع رکھنے والی قوم کی زبان میں بنجماً نجماً ہوا ہے اور جس میں اخلاق و کردار کی اصلاح کے نفسیاتی اصول کو کبھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔

ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک روایت نقل کی ہے جس میں آپ فرماتے ہیں "کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں نہ ہو، لیکن بات یہ ہے کہ ہماری سمجھ اس کے فہم سے قاصر ہے" اسی بنا پر اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو

خطاب کر کے فرماتا ہے:۔

لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ	تاکہ جو چیزیں آپ پر نازل کی گئی ہیں آپ لوگوں
إِلَيْهِمْ۔ (النحل)	کے سامنے ان کی تشریح کر دیں۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں: سنتِ ثابتہ قرآن کے منافی نہیں بلکہ اس کی مؤید ہے اگرچہ قرآن میں سنت کے الفاظ کی نصِ صریح نہ ہو کیونکہ کوئی شخص قرآن کو ایسا نہیں سمجھ سکتا جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سمجھا ہے۔

حضرت مکحول الدمشقی فرماتے تھے:۔

القرآن احوج الی السنۃ من	قرآن کو سنت کی زیادہ احتیاج ہے
السنۃ الی القرآن۔ [1]	بہ نسبت اس کے کہ سنت کو قرآن کی ضرورت ہو

یحییٰ بن ابی کثیر کہتے تھے:۔

السنۃ قاضیۃ علی الکتاب و	سنت کتاب اللہ پر حکم کرنے والی ہے اور کتاب
لیس الکتاب قاضیاً علی السنۃ	سنت پر حکم نہیں کرتی

ایک غلط فہمی کا ازالہ اس سے اس غلط فہمی میں نہ رہنا چاہئے کہ سنت قرآن کے تابع نہیں اور قرآن سنت کے تابع ہے۔ اس قول کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کی حیثیت متن کی اور سنت کی حیثیت شرح کی ہے۔ قرآن میں خفی بھی ہے مشکل اور مجمل بھی، سنت ان سب کا بیان کرتی ہے اور ان کی تفصیل کرتی ہے۔ اس بنا پر سنت سے جو کچھ سمجھ میں آتا ہے اس سے فہم قرآن میں مدد لی جا سکتی ہے اور سنت چونکہ شرح کی حیثیت رکھتی ہے اور اس میں خفا، اجمال اور اشکال نہیں ہے اس لئے قرآن مجید کو اس کے لئے اصل تو کہا جائے گا مبین نہیں

---

[1] حافظ ابو عمر بن عبد البرؒ فرماتے ہیں۔ مکحول کا مطلب ان الفاظ سے یہ ہے کہ کتاب اللہ کیلئے سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبین ہے یعنی اس کی مراد واضح کرتی ہے انما تقضی علیہ وتبین المراد منہ۔ (جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۹۱)

[2] امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں السنۃ قاضیۃ علی الکتاب کی جگہ یوں تعبیر ہونی چاہئے ان السنۃ تفسر الکتاب وتبینہ۔ (جامع بیان العلم ج ۲)

سمجھا جاسکتا۔ چنانچہ جن لوگوں نے سنت سے قطع نظر کرکے عبادات کے اوقات اور ارکان اور ان کے طریقے خود قرآن سے اخذ کرنے کی کوشش کی ہے انھوں نے عجیب طرح کی مضحکہ انگیز تاویلوں سے کام لیا ہے۔ اور پھر بھی وہ عبادات کو اس منظم طریقہ پر قائم نہیں رکھ سکے جس پر اب تک امت محمدیہ کا عمل متواتر رہا ہے۔ اور اگر ان کی توجیہہ و تاویل تعامل امت کے مطابق ہوتی بھی ہے تو وہ اس قدر کمزور ہوتی ہے کہ سب کا اس پر متفق ہونا مشکل ہے۔ یہاں ہم صرف اس کی ایک مثال پر کفایت کریں گے۔

قرآن مجید میں اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الی ذکر اللہ فرما کر اس کا حکم دیا گیا ہے کہ جمعہ کے دن نماز کی اذان ہو تو اللہ کے ذکر کے لئے دوڑو۔ اب اگر آپ سنت سے بالکل قطع نظر کرلیں تو محض اس آیت کو دیکھکر یہ نہیں بتا سکتے کہ یہ حکم جمعہ کے دن کی کس نماز کے لئے ہے اور اگر جمعہ کی الگ کوئی نماز ہوتی ہے تو وہ کس وقت پڑھی جاتی ہے۔ ایک منکر حدیث کے سامنے اس کا ذکر آیا تو اس نے کہا کہ سنت سے استمداد کی ضرورت نہیں ہے وذروا البیع تم بیع چھوڑ دو' اور وابتغوا من فضل اللہ یہ دونوں ٹکڑے اس بات کی دلیل ہیں کہ جمعہ کی نماز ظہر کے وقت ہوتی ہے کیونکہ بیع و شرا اور ابتغاء فضل اللہ یعنی رزق کے طلب کرنے کا وقت دوپہر کا ہی ہوتا ہے۔

اب غور کیجئے یہ توجیہ کس قدر کمزور ہے آپ تصور کیجئے اگر آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اور مسلمانوں کا تعامل معلوم نہ ہوتا تو کیا اس وقت بھی محض وذروا البیع اور وابتغوا من فضل اللہ کو سامنے رکھکر جمعہ کی نماز کا وقت قطعیت کے ساتھ متعین کرسکتے تھے اور کیا آپ کو یہ خیال نہ آتا کہ دوپہر کو لوگ عموماً آرام کرتے ہیں خرید و فروخت کا اور طلب رزق کا وقت صبح اور شام ہی ہے جیسا کہ بالعموم ہندوستان میں دیکھا جاتا ہے۔

یہاں ہم نے صرف ایک مثال نقل کی ہے۔ سنت سے الگ رہ کر قرآن مجید سے آپ عبادات وغیرہ کی جو شکلیں، ارکان و آداب اور اوقات و شرائط مستنبط کریں گے، ان سب کا

حال یہی ہوگا۔ اور آپ مسلمانوں کو کسی ایک قطعی نظام کے ساتھ وابستہ نہیں کر سکیں گے جس کے باعث ان میں گمراہی پھیلے گی تشتت اور افتراق پیدا ہوگا اور ان کا شیرازۂ جمعیت پریشان ہو کر رہ جائیگا۔ اسی قسم کی گمراہیاں ہیں جن سے محفوظ رکھنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

انی قد ترکت فیکم شیئین لن	میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں جن کے بعد
تضلوا بعدھما ابدا کتاب اللہ	تم کبھی بھی گمراہ نہیں ہوگے۔ ایک کتاب اللہ اور دوسری
وسنتی ولن یفترقا حتی یردا	میری سنت اور یہ دونوں حوض کوثر پر وارد ہونے
علی الحوض۔ [۱]	تک ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔

مالک بن انس سے منقول ہے کہ سید کونین نے حجۃ الوداع میں فرمایا۔

امران ترکتھما فیکم لن تضلوا	دو امر ہیں جن کو میں تم میں چھوڑے جاتا ہوں جب تک
ما تمسکتم بھما کتاب اللہ و	تم ان سے تمسک کروگے گمراہ نہیں ہوگے۔ ایک
سنۃ نبیہ۔	کتاب اللہ اور دوسری سنت نبی۔

صحابۂ کرام اور سنت کا احترام یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرام بعض اوقات کسی مسئلہ کی نسبت کوئی حکم صادر فرما دیتے لیکن انھیں بعد میں معلوم ہوتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فتویٰ اس کے خلاف ہے تو فوراً اس سے رجوع کر لیتے تھے۔ ایک مرتبہ بنو ثقیف کے ایک شخص نے حضرت عمرؓ سے دریافت کیا کہ بیت اللہ کی زیارت کرنے کے بعد اگر کسی عورت کو حیض آ جائے تو وہ کوچ کرے یا نہیں۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ اس پر ثقفی بولا کہ اس قسم کی ایک عورت سے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو آپ کے فتوے کے خلاف فتویٰ دیا تھا۔ یہ سنتے ہی حضرت عمرؓ کھڑے ہوگئے اور ثقفی کو دُرّے سے مار کر فرمایا جس چیز کے بارہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فتویٰ دے چکے ہیں تم اس کے متعلق مجھ سے کیوں دریافت کرتے ہو۔ حضرت عمرؓ فرماتے تھے کہ دیت عاقلہ کے لئے ہے اور کسی عورت کو شوہر کی دیت میں سے وراثت نہیں مل سکتی۔ ضحاک بن سفیانؓ

---

[۱] مستدرک حاکم عن ابی ہریرۃ کتاب العلم ج ص ۹۳۔

نے انھیں بتایا کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو لکھا تھا کہ اشیم الضبی کی بیوی کو اس کی دیت میں سے حصہ دیدیا جائے حضرت عمرؓ نے یہ سن کر اپنے قول سے رجوع کر لیا۔ [1]

اسی طرح جنین (حمل) کی دیت کے بارہ میں حضرت عمرؓ کا قیاس یہ تھا کہ عام دیتوں کی طرح اس میں بھی گائے بکری وغیرہ دینی ہوگی لیکن جبکہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے آپ کو معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلہ میں ایک غلام یا باندی کے آزاد کرنے کا حکم دیا ہے تو آپ نے حضرت مغیرہ سے ان کی روایت پر ایک شاہد طلب کیا اور جب محمد بن مسلمہ نے شہادت دیکر اس کی توثیق کردی تو حضرت عمرؓ کو اطمینان ہوگیا اور پھر آپ نے اس حدیث کی روشنی میں ہی دیت جنین کے متعلق فیصلہ کیا۔ [2]

بعض روایتوں میں تو یہاں تک آتا ہے کہ اسی قسم کے ایک معاملہ میں حضرت عمرؓ نے ایک صحابی کی زبانی حدیث سن کر ارشاد فرمایا "اگر ہم یہ روایت نہ سنتے تو قریب تھا کہ اپنی رائے سے کام لیکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے خلاف کوئی حکم صادر کر بیٹھتے"

صحابہ اگر کسی چیز پر عامل ہوتے اور ان کو معلوم ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول یا فعل اس کے خلاف ہے تو فوراً اس سے تائب ہوجاتے تھے۔ حضرت عمرؓ ایک مرتبہ شام تشریف لے جارہے تھے مقام سرغ پر پہنچکر انھیں معلوم ہوا کہ وہاں وبا پھیلی ہوئی ہے۔ اب آپ بڑے متردد ہوئے، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر کسی شہر میں وبا پھیلی ہوئی ہو تو وہاں مت جاؤ اور اگر تم کسی شہر میں موجود ہو اور وہاں وبا پھیلنی شروع ہوجائے تو اس کے خوف سے بھاگو مت۔ حضرت عمرؓ یہ سنکر سرغ سے واپس تشریف لے آئے۔

کسی مسئلہ میں اگر انھیں شک ہوتا تھا تو خود اقدام نہیں کرتے تھے پہلے اس کا حکم کتاب اللہ میں تلاش کرتے اگر وہاں نہ ملتا تو سنت میں تلاش کرتے تھے۔

---

[1] معالم السنن ج ۴ ص کتاب الدیات ص ۵۰۰۹۰۱ ـ [2] ایضاً ج ۴ ص ۲۲ ـ

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس ایک عورت آئی جس کے نواسہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے حقِ وراثت کا مطالبہ کیا۔ آپ نے فرمایا "تمہارے لئے قرآن میں کوئی حکم نہیں ہے اور جہاں تک مجھ کو معلوم ہے سنت میں بھی کچھ نہیں ہے، اب تم چلی جاؤ، میں لوگوں سے دریافت کروں۔" آپ نے صحابۂ کرام سے استفسار کیا تو حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے فرمایا: "میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھا۔ آپ نے اسی طرح کے ایک معاملہ میں نانی کو چھٹا حصہ دلوایا تھا۔" حضرت ابوبکرؓ نے پوچھا "تمہارا کوئی گواہ بھی ہے؟" محمد بن مسلمۃ الانصاریؓ کھڑے ہو کر بولے "میں ہوں" اور انھوں نے وہی فرمایا جو حضرت مغیرہ نے کہا تھا۔ یہ سن کر آپ نے عورت کو سُدس دیدینے کا حکم صادر کر دیا۔[1]

ابن خزیمہ کہتے تھے "اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث ثابت ہو جائے تو اس کے ہوتے ہوئے کسی اور کو کچھ کہنا درست نہیں ہے۔"[2]

جو لوگ حدیث کو ہی نہیں مانتے وہ ائمہ دین کے ان اقوال کو کیا مانیں گے۔ لیکن ہم نے ان کو اس غرض سے نقل کیا ہے کہ ان اقوال سے سنت کی اصل حیثیت پر روشنی پڑتی ہے۔ ہم نے بجائے اس کے کہ سنت اور قرآن کے باہمی تعلق پر بحث کے لئے اپنے دلائل کے سلسلہ میں یہ چیزیں بیان کرتے، ان بزرگوں کے حوالے سے انھیں بیان کر دیا ہے۔

صحابۂ کرام جو زبان داں ہونے کے باوصف درسگاہِ نبوت سے براہِ راست فیضیاب ہونے کا شرف رکھتے تھے اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے تھے کہ قرآن مجید کی بہت سی آیتیں مجمل ہیں، کہیں ان آیتوں میں ظاہری اعتبار سے اشکال اور خفا پیدا ہو گیا ہے۔ اگر اس اجمال و خفا کو دور کرنے کے لئے سنت سے کام نہ لیا جائے تو ظاہر ہے کسی مکمل ضابطۂ احکام اور مجموعۂ قوانین کی ترتیب دشوار ہو جائے۔ مثلاً قرآن مجید میں ہے اقیموا الصلوٰۃ نماز پڑھو۔

---

[1] ابوداؤد کتاب الفرائض باب فی الجدۃ۔ [2] یہ سب اقوال و روایات مفتاح الجنۃ، جامع بیان العلم جلد ثانی ابن عبدالبرؒ اور مفتاح السنۃ للخولی سے ماخوذ ہیں۔

اٰتوا الزکوٰۃ نماز ادا کرو۔ والسارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیھما۔ احل اللہ البیع وحرم الربوا۔ اللہ نے تمہارے لئے خرید و فروخت حلال کر دی اور سود کو حرام قرار دیدیا ہے لیکن تمام قرآن میں یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ نماز کس طرح پڑھیں اور اس کے ارکان کیا ہیں اور ان میں کیا ترتیب ہے؟ زکوٰۃ کس کس مال پر واجب ہے اور کتنی، چور کا ہاتھ کاٹنے کے لئے کوئی نصاب مقرر ہے یا نہیں اگر نہیں ہے تو اس میں بڑا اختلال لازم آتا ہے۔ کسی نے ایک پیسہ چرا لیا اور اس کو دست بریدہ کر دیا گیا۔ اور اگر نصاب مقرر ہے تو وہ کتنا؟ پھر ایک چوری میں دونوں ہاتھ بیک وقت قطع کئے جائیں گے یا ایک ہی ہاتھ کاٹا جائے گا اور اگر ایک ہی ہاتھ قطع ہوگا تو دایاں یا بایاں۔ اسی طرح قرآن نے بیع کو حلال اور ربوٰا کو حرام تو بتا دیا لیکن لغت میں ربوٰ کے معنی صرف زیادتی کے ہیں یہ نہیں بتایا گیا کہ اس زیادتی سے کیا مراد ہے؟ اور کس قسم کی اور کتنی زیادتی حرام ہے۔

اگر صرف قرآن پر ہی بایں معنی مدار شریعت ہے کہ احادیث کی بیان کی ہوئی تشریحات کو یک قلم نظر انداز کر دیا جائے اور الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی فرما کر جس دین کے اکمال کا مژدہ سنایا گیا ہے اگر اس کا منبع و مصدر صرف وہ قرآن ہے جس کے معانی و مطالب کی تفہیم میں صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو کوئی دخل نہ ہو تو ان تمام استفسارات بالا کا جواب اس میں ہونا چاہئے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس میں نہیں ہے، اہل سنت کو قرآن کے لئے بیان و تفسیر یا تفصیلِ اجمال قرار دیا جائے اور دونوں کو ملا کر تشریع احکام کا منشاء کہا جائے تو بے شبہ قرآن مجید کا دعویٰ اتمام نعمت و اکمال دین درست ہے اور خود قرآن مجید کی تصریحات سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ سنت اس کے لئے بمنزلہ بیان و تشریح ہے۔ آیت ذیل پر پھر غور کیجئے۔

ؔ حافظ ابن عبد البر فرماتے ہیں۔ والبیان منہ صلی اللہ علیہ وسلم علی ضربین بیان المجمل فی الکتاب العزیز کالصلوات الخمس فی مواقیتھا وسجودھا ورکوعھا وسائر احکامھا وکبیانہ الزکوٰۃ وحدھا ووقتھا وما الذی تؤخذ منہ الاموال وبیانہ مناسک الحج قال صلی اللہ علیہ وسلم اذ حج بالناس خذوا عنی مناسککم لان القرآن انما ورد بجملۃ فرض الصلوٰۃ والزکوٰۃ والحج دون تفصیل والحدیث مفصل (جامع بیان العلم وفضلہ)

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ   ہم نے آپ پر نصیحت کی کتاب نازل کی تاکہ جو تعلیم لوگوں کی
لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ   طرف بھیجی گئی ہے آپ ان پر اسے اچھی طرح واضح کردیں۔

دیکھیے لِتُبَيِّنَ میں لام غایت کا ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جو قرآن نازل کیا ہے اس کی غایت یہی ہے کہ آپ اس کو کھول کھول کر لوگوں کے سامنے بیان کریں یعنی آپ ہی اس کے بہترین شارح، مفسر اور اس کے معانی و مطالب کو بیان کرنے والے ہیں۔ کوئی شخص فہم قرآن میں آپ سے اور آپ کی بیان فرمودہ تشریحات سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔

مطرف بن عبداللہ سے کسی نے کہا تم ہم سے سوائے قرآن کے اور کچھ بیان نہ کیا کرو۔ فرمایا "بخدا ہم قرآن کے بدلے کسی اور چیز کو تمہارے سامنے پیش نہیں کرتے البتہ (احادیث سنا کر) اس ذات گرامی کا ارادہ کرتے ہیں جو ہم سب سے زیادہ عالم بالقرآن تھے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم[1]

ایسا ہی ایک واقعہ حضرت سعید بن جبیرؓ کے ساتھ پیش آیا۔ ایک مرتبہ انھوں نے ایک حدیث بیان کی، ایک شخص بولا "قرآن مجید میں تو اس کے خلاف ہے" سعید بن جبیرؓ نے فرمایا

"میں ایک حدیث بیان کرتا ہوں اور تم اس پر کتاب اللہ پیش کرتے ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری بہ نسبت کتاب اللہ کو زیادہ اچھی طرح جانتے تھے"[2]

قرآن کے اجمال اور سنت کی حیثیت تفصیل و بیان کی بنا پر صحابہ کرام سنت کے ساتھ بہت اعتنا کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اسی کے ذریعہ قرآن کی آیات کے صحیح معانی و مطالب متعین ہو سکتے ہیں۔ حضرت عمر بن الخطابؓ فرماتے تھے۔

"عنقریب تمہارے پاس ایسے لوگ آئیں گے جو قرآن مجید کے شبہات کے ساتھ تم سے مجادلہ کریں گے تم ان پر سنن کے ذریعہ گرفت کرنا کیونکہ اصحاب سنن کتاب اللہ کے بڑے عالم ہوتے ہیں"[3]

---

[1] جامع بیان العلم ج ۲ و موافقات امام شاطبی ج ۴ ص ۲۶۔ [2] مسند دارمی۔
[3] موافقات امام شاطبی ج ۴ ص ۱۷۔ وعن ابن مسعود ستجدون اقواما یدعونکم الی کتاب اللہ وقد نبذوہ وراء ظهورهم فعلیکم بالعلم وعن عمر انما اخاف علیکم رجلین رجل یتاول القرآن علی غیر تاویله ورجل ینافس (علی الملک) (ایضاً کتاب مذکور یہاں آمد کو نقل کرنے کے بعد (باقی صفحہ ۹۳ پر ملاحظہ

بعینہ یہی مقولہ لالکائی نے حضرت علی بن ابی طالبؓ سے نقل کیا ہے۔

علامہ ابن سعدؒ نے طبقات میں بطریق عکرمہ حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے ان کو خوارج کے پاس بھیجا تو فرمایا "تم ان کے پاس جاؤ اور مباحثہ کرو، مگر دیکھنا قرآن کو درمیان میں نہ لانا کیونکہ وہ معانی مختلفہ کو محتمل ہوتا ہے۔ البتہ سنت سے احتجاج کرنا" ابن عباسؓ نے فرمایا "میں تو ان کی بہ نسبت قرآن کو زیادہ جانتا ہوں کیونکہ وہ ہمارے گھر میں ہی نازل ہوا ہے" حضرت علیؓ بولے "ہاں تم سچ کہتے ہو لیکن القرآن حمال ذو وجوہ (قرآن میں اجمال کی وجہ سے) مختلف معانی کی گنجائش نکل سکتی ہے، تم بھی کہتے رہوگے اور وہ بھی کہتے رہیں گے، فیصلہ کچھ نہ ہوگا۔ اس لئے سنن سے استدلال کرنا، وہ اس سے بچ کر کہیں نہیں جا سکیں گے" چنانچہ حضرت ابن عباسؓ نے خوارج سے سنت کی روشنی میں مناظرہ کیا تو وہ لاجواب ہو گئے۔

دین کا مدار قرآن و سنت دونوں پر ہے

جیسا کہ ہم ابھی ضمناً اشارہ کر چکے ہیں۔ دراصل دینِ الٰہی کا مکمل نقشہ قرآن و سنت کے امتزاج ہی سے سامنے آسکتا ہے۔ قرآن بطریق متن اور سنت بطور تفسیر و تشریح ہے۔ اور تشریع احکام کا مبنیٰ دونوں ہیں۔ چنانچہ صحابۂ کرام و تابعین عظام بھی یہی سمجھتے تھے۔ اور ان دونوں پر ہی دین کا مدار رکھتے تھے۔ میمون بن مہرانؒ سے ایک روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس کوئی خصومت لے کر آتا تھا تو آپ قرآن میں اس کے لئے حکم تلاش کرتے تھے اگر اس میں نہ ملتا تو سنت میں تلاش کرتے اور اگر اس میں بھی انہیں کوئی حکم دستیاب نہیں ہوتا تھا تو لوگوں کو جمع کر کے وہ مسئلہ پیش کرتے اور ان سے پوچھتے کہ آپ کو اس مسئلہ کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فیصلہ یاد ہے یا نہیں؟ وہ لوگ جواب اثبات میں دیتے تو آپ فرماتے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۲) علامہ شاطبیؒ فرماتے ہیں۔ وهذا أنا أرى في هذا المعنى حملها العلماء على تأويل القرآن بالرأي مع طرح السنن یعنی اس مضمون کے اور بہت سے آثار ہیں جن کا محمل علماء سلف کے یہاں یہ ہے کہ آیات قرآنی کے معنی سنن کو پس پشت ڈال کر اپنی رائے سے بیان کرنا۔

الحمد لله الذی جعل فینا　　تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے ہم میں دین کی
من یحفظ علینا دیننا　　حفاظت کرنے والے پیدا کئے اور انہیں باقی رکھا۔

جابر بن زیدؒ کہتے ہیں ایک مرتبہ طواف میں حضرت ابن عمرؓ مجھ سے فرمانے لگے" ابوالشعثار، تم فقہاء بصرہ میں سے ہو، بجز قرآن ناطق اور سنت صحیحہ کے کسی اور چیز سے فتویٰ نہ دینا۔ اگر تم نے ان سے تجاوز کیا تو خود بھی ہلاک ہو گے اور دوسروں کو بھی ہلاک کرو گے"

اسی طرح ابو سلمہؒ بصرہ میں تشریف لائے اور حسن بصریؒ ان سے ملنے آئے تو آپ نے حضرت حسنؒ سے فرمایا" مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ تم اپنی رائے سے فتویٰ دیتے ہو، خبردار کبھی ایسا نہ کرنا جب تک تمہارے پاس مسئلہ مستفتی بہ سے متعلق کوئی سنت یا قرآنی آیت نہ ہو"

سعید بن المسیبؒ نے ایک شخص کو دیکھا کہ دو رکعتوں کے بعد بھی کچھ اور رکعتیں پڑھ رہا ہے اس شخص نے نماز سے فارغ ہو کر پوچھا" ابو محمد! کیا خدا مجھ کو اس نماز پر عذاب دے گا؟" فرمایا" نماز پر نہیں بلکہ سنت کا خلاف کرنے پر" سعید بن جبیرؒ فرماتے تھے" کوئی قول بغیر عمل کے اور کوئی قول و عمل بغیر نیت کے مقبول نہیں ہوتا اور قول و عمل اور نیت اس وقت تک مقبول نہیں ہوتے جب تک وہ سنت کے موافق نہ ہوں" حضرت حسن بصریؒ سے بھی اسی قسم کا ایک مقولہ مروی ہے۔

بہرحال اس طرح کے سینکڑوں آثار ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ سلف صالحین نے دین قیم کی ہدایتوں کا مرکز قرآن و سنت دونوں کو ہی سمجھا اور اس بنا پر جس طرح انھوں نے قرآن کی حفاظت اپنی جان فروشانہ قربانیوں سے کی اور اس کی حرمت کو برقرار رکھنے کے لئے خون کے آخری قطرے سے بھی دریغ نہیں کیا ٹھیک اسی طرح انھوں نے سنت رسول اللہ

؎ مشہور و معروف عربی داں فاضل ڈاکٹر اسپرنگر نے الاصابہ فی معرفۃ الصحابہ کے دیباچہ میں لکھا ہے" نہ کوئی قوم دنیا میں ایسی گذری نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال سا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے"

صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حرزِ جان بنا کر رکھا اور اس کی حفاظت میں انسانی کوشش وسعی کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ حضرت ابوذر غفاریؓ فرمایا کرتے تھے "اگر میری گردن پر تلوار رکھدی جائے اور مجھکو یہ معلوم ہو کہ قتل ہونے سے پہلے ایک کلمہ بھی جو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے لوگوں تک پہنچا سکتا ہوں تو میں اس امانت کو دوسروں تک ضرور پہنچا دوں گا۔"

حضرت ابوہریرہؓ نے رات کے تین حصے کر رکھے تھے، ایک میں سوتے تھے اور ایک حصہ عبادت و تلاوتِ قرآن میں بسر کرتے تھے اور ایک حصہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث یاد کرتے تھے۔ آج جبکہ بنا بنایا مکمل دین آپ کے پاس ہے آپ کو انکارِ حدیث کی جسارت ہوتی ہے لیکن اس وقت کا تصور کیجیے جبکہ آپ کے پاس ایک حدیث بھی نہ ہوتی اور صرف قرآن مجید ہوتا تو کیا اس وقت بھی یہ دین برحق اپنی اس صورت میں آپ کو نظر آسکتا تھا؟

حدیث کی تشریعی حیثیت اور اس سے غرض

یہاں یہ واضح کردینا ضروری ہے کہ ہم نے حدیث کی تشریعی حیثیت کا بار بار ذکر کیا ہے اور اس کو آیات بینات سے ثابت کرچکے ہیں لیکن یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہئے کہ تشریع کے باب میں قرآن و حدیث دونوں ایک پلّہ کے نہیں ہیں۔ قرآن قطعی الثبوت ہے اور حدیث ظنی پھر دونوں قوت و حکم کے اعتبار سے یکساں کس طرح ہوسکتے ہیں۔ اس بناء پر اگر کوئی حدیث قرآن مجید کے کسی قطعی حکم کے خلاف ہو تو اس کو قبول نہیں کیا جائے گا کیونکہ سند و الفاظِ حدیث کے لحاظ سے اس میں متعدد احتمالات ہوسکتے ہیں۔ بعض لوگوں کو اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول اور وما اٰتٰکم الرسول فخذوہ دیکھکر یہ شبہ ہوگیا ہے کہ قرآن کی طرح سنت بھی تشریع میں مستقل حیثیت رکھتی ہے یہ خیال درست نہیں کیونکہ قرآن مجید نے ہی خود اس کی بھی تصریح کی ہے کہ

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی خواہش سے کچھ نہیں فرماتے
اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی	بلکہ وہ نازل شدہ وحی ہوتی ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اصل وحی (قرآن) ہے اور نطق نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام

اس سے نکلی ہوئی فرع، اس بنا پر لامحالہ نطقِ گرامی وحی متلو کے مطابق ہوگا ، بالفرض اگر دونوں میں مطابقت کی کوئی صورت نہ ہو تو حدیث کو ترک کرنا پڑے گا۔ لیکن اس حیثیت سے نہیں کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے بلکہ اس وجہ سے کہ قرآن کے ایک حکم ظاہر الدلالۃ سے متعارض ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اس قول کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف انتساب ہی نادرست ہے۔

پس سنت کی تشریع سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ قرآن کی طرح اس باب میں مستقل حیثیت رکھتی ہے بلکہ غرض صرف یہ ہے کہ سنت وحی الٰہی کے لئے بمنزلہ بیان اور تفصیل کے ہے اگر کسی صحیح الثبوت سنت سے کوئی ایسا حکم ملے جس کے متعلق قرآن میں سکوت ہو یا اس کے کسی ایک ہی پہلو کو بیان کیا گیا ہو، یا اس حکم کے بیان میں کسی قسم کا کوئی اشکال و خفاء رہ گیا ہو تو قرآن و سنت دونوں کو ملا کر ایک حکمِ مفصل کا استنباط کیا جائے گا اور اس وقت قرآن کی حیثیت متن کی اور سنت کی حیثیت شرح کی ہوگی۔ اب ہم ذیل میں اس کی چند مثالیں لکھتے ہیں تاکہ تشریع بالسنت کی حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے۔

۱۔ قرآن میں صرف نماز کا حکم ہے لیکن رکعات کی تعداد نہیں بتائی گئی۔ سنت نے ان کو بیان کر دیا ہے۔ اگر کوئی شخص مغرب میں دو، فجر میں تین، ظہر، عصر اور عشاء میں پانچ پانچ یا دو دو اور تین تین رکعتیں پڑھے گا تو اس کی نماز بالکل نہیں ہوگی اور وہ نہ صرف سنت کا مخالف کہا جائیگا بلکہ قرآن کا بھی۔

۲۔ قرآن نے صرف اتنا بتایا ہے کہ نکاح حلال ہے اور زنا حرام، لیکن نکاح مشروع کے علاوہ نکاح غیر مشروع کون کون سے ہیں۔ قرآن میں ان کا تفصیلی ذکر موجود نہیں ہے۔ صحیح حدیث میں ہے۔

ایما امراۃ نکحت بغیر اذن ولیھا — جس عورت نے بغیر اجازت ولی کے نکاح کر لیا

فنکاحھا باطل۔ ؎ — اس کا نکاح باطل ہے۔

ؔ[illegible]

یہاں اس سے بحث نہیں کہ عورت سے باکرہ ثیبہ دونوں مراد ہیں یا ایک اور ولی کون ہے اور ولایت کا مبنیٰ خیار بلوغ پر ہے یا بکارت پر۔ کہنا یہ ہے کہ آپ اس حدیث کو نظر انداز نہیں کر سکتے قرآن مجید نے نکاح کو اجمالاً بیان کیا ہے۔ احادیث صحیحہ میں نکاح کے جو شرائط صحت وغیرہ تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں ان کو قرآن کے ساتھ ملا کر ایک مکمل قانون نکاح تیار کرنا ہوگا۔

۳۔ قرآن میں صرف ربوا کی حرمت کا ذکر ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہوا کہ ربوا سے مراد کیا ہے؟ اور اس کی حرمت کا مدار کس چیز پر ہے؟ حدیث نے اس سوال کا جواب دیا ارشاد نبوی ہے

الذھب بالذھب والفضۃ بالفضۃ — بیچو سونے کو سونے کے بدلے میں چاندی کو چاندی کے

والبر بالبر والشعیر بالشعیر والتمر — گیہوں کو گیہوں کے، جو کو جو کے، کھجور کو کھجور کے

بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثل سواء — اور نمک کو نمک کے بدلے میں جنس بجنس برابر سرابر

بسواء یداً بید اذا الفضل ربوا[1] — دست بدست اور زیادتی ربوا ہے۔

اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ قرآن مجید میں جو لفظ ربوا آیا ہے اس سے مراد کیا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ حدیث سے بھی پوری تفصیل اس لئے سمجھ میں نہیں آتی کہ اس میں حرمت ربوا کے منشا کی جزوی طور پر تعیین نہیں کی گئی یہی وجہ ہے کہ ائمہ مجتہدین نے اپنے اپنے اجتہاد کی روشنی میں علت حرمت کی تشخیص فرمائی یعنی الفاظ حدیث میں اس کی تصریح نہیں کہ حرمت ربوا کا مدار جنسیت اور تفاضل دونوں پر ہے یا صرف ایک پر یا از قسم مکیلات و موزونات ہونے پر، یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس سے تشریف لے گئے اور ہم پر ربوا کی حقیقت مکمل طور پر واضح نہیں ہوئی" تاہم غور کیجئے اگر یہ حدیث نہ ہوتی تو کیا آپ محض الفاظ قرآنی سے ربوا کی حقیقت کسی درجہ میں بھی سمجھ سکتے؟ یقیناً نہیں۔ پس ربوا کے متعلق جو احکام وضع کئے جائیں گے ان کے لئے قرآن کو اصل اور حدیث کو اس کا بیان قرار دے کر کئے جائیں گے۔

۴۔ قرآن مجید میں دو بہنوں کو نکاح میں بیک وقت جمع کرنے کو حرام قرار دیا گیا ہے

---

[1] صحیح مسلم و دیگر کتب صحاح (باب الربا)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ اس تحریم کی وجہ یہ ہے کہ :-

دو بہنوں کو نکاح میں جمع کر دینے سے قطع صلۂ رحم لازم آجاتا ہے جو اللہ کے نزدیک نہایت مبغوض اور قبیح چیز ہے اس کے علاوہ بھانجی اور خالہ، بھتیجی اور پھوپی ان دونوں کو اگر نکاح میں جمع کیا جائے تو اس سے بھی قطع رحم لازم آتا ہے اس بنا پر آپ نے ان کو نکاح میں جمع کرنے کی حرمت کا بھی اعلان فرما دیا۔ آپ کے اس فرمان کو معاذ اللہ حکم قرآن کے خلاف نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ اس کی تعبیر یوں کی جائے گی کہ قرآن مجید نے جمع بین الاختین کا ذکر کر کے صرف حکم حرمت کی علت کی طرف اشارہ کر دیا۔ اس سے مقصد یہ نہیں ہے کہ حرمت جمع کا حکم صرف ایک ہی صورت تک محدود رکھا جائے اس لئے آپ کو بحیثیت شارع اسلام ہونے کے اس کا حق ہے کہ قرآن کی اس اصل کی روشنی میں دو بہنوں کے علاوہ بھانجی اور خالہ، بھتیجی اور پھوپی کو ایک نکاح میں جمع کرنے کی حرمت کا بھی اعلان فرمادیں ۔

ان چند مثالوں سے یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ ہم حدیث کی تشریعی حیثیت سے کیا مراد لیتے ہیں یعنی جب ہم کسی چیز کے متعلق احکام وضع کرنا چاہتے ہیں تو قرآن مجید کو اصل قرار دے کر احادیث کا تتبع کرتے ہیں اور پھر دونوں کی تطبیق سے مسائل کا استنباط کرتے ہیں نہ یہ کہ سنت کو مستقل تشریعی حیثیت حاصل ہے اور قرآن مجید سے قطع نظر کر کے صرف سنت سے استخراج احکام کیا جا سکتا ہے علامہ ابو اسحاق الشاطبی متوفی ۷۹۰ھ نے "الموافقات" کی جلد چہارم میں صفحہ ۳ سے صفحہ ۲۰ تک اس پر مفصل بحث کی ہے کہ سنت کو کتاب اللہ سے منطبق کرنے کی کتنی صورتیں ہیں اور اس ذیل میں مختلف مذاہب بیان کئے ہیں اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں :-

"سنت میں جو معانی اور احکام تفصیلیہ پائے جاتے ہیں وہ سب قرآن مجید میں موجود ہیں لیکن وہ صرف ان ہی لوگوں کو معلوم ہو سکتے ہیں جو قرآن میں تفقہ تام رکھتے ہوں اور اس میں تدبر کرتے ہوں اگرچہ وہی معانی اور احکام سنت میں زیادہ وضاحت اور تفصیل کے ساتھ ملیں گے"

تدوین حدیث

گذشتہ بحث سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ قرآن مجید کے فہم میں حدیث سے مدد لینا ناگزیر ہے، اب ہم تدوین اور صحت حدیث پر ایک تاریخی نظر ڈالکر بتانا چاہتے ہیں کہ روایت اسناد اور درایت کے لحاظ سے حدیث کا مرتبہ کس قدر بلند ہے تاکہ منکرین حدیث کو اپنے دلائل پر غور کرنے کا موقع ملے۔

عہد نبوت اور تدوین حدیث یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں حدیث لکھنے کا اتنا اہتمام نہیں کیا گیا جتنا کہ قرآن مجید کے لکھنے کا کیا گیا بلکہ بعض احادیث سے یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کتابت حدیث کی ممانعت کر رکھی تھی۔

حضرت ابوسعید الخدری سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لا تکتبوا عنی ومن کتب عنی	تم میری احادیث نہ لکھو اور جو شخص قرآن کے علاوہ
غیر القرآن فلیمحہ وحدثوا	میری حدیثیں لکھتا ہو اس کو چاہیئے کہ انہیں مٹا دے
عنی فلا حرج ومن کذب	ہاں میری حدیث بیان کرو اس میں کچھ حرج نہیں
علی متعمداً فلیتبوأ مقعدہ	ہے اور جو شخص قصداً مجھ پر جھوٹ باندھے اس کو
من النار۔ (صحیح مسلم)	اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنا لینا چاہیئے

اسی کے ساتھ بعض روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بعض خاص خاص ارشادات نبوی تھے جنھیں آپ نے خود قلمبند کرایا یا کسی نے انھیں خود قلمبند کرنا چاہا تو آپ نے اس کی ممانعت نہیں فرمائی۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ خزاعہ کے آدمیوں نے فتح مکہ کے سال

بنو لیث کے کسی ایک آدمی نے اپنے ایک مقتول کے بدلہ میں قتل کر دیئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ اپنی سواری پر سوار ہوئے اور حسب ذیل خطبہ ارشاد فرمایا۔

"اللہ نے مکہ میں قتل کرنے کی ممانعت کر دی ہے اور مکہ پر رسول اللہ اور مومنین مسلط کر دیئے گئے ہیں۔ یہ نہ مجھ سے قبل کسی کے لئے حلال تھا اور نہ میرے بعد کسی کے لئے حلال ہے۔ ہاں اس دن میں صرف ایک ساعت کے لئے حلال تھا لیکن اب اس وقت قتل و قتال حرام ہے نہ تو یہاں کا کانٹا کاٹا جا سکتا ہے اور نہ یہاں کے کسی درخت کو قطع کیا جا سکتا ہے اور نہ یہاں کوئی پڑی ہوئی چیز اٹھائی جا سکتی ہے۔ صرف وہ اٹھا سکتا ہے جس کی چیز گم ہو گئی ہو اور وہ اسے ڈھونڈنے نکلا ہو۔ اور جس شخص کا کوئی آدمی قتل کر دیا گیا ہو اس کو اختیار ہے چاہے مقتول کے بدلہ میں دیت لے یا قصاص؛"

اتنے میں ایک یمنی شخص آیا اور اس نے عرض کیا "یا رسول اللہ مجھ لکھ لوں (یعنی آپ کا یہ خطبہ) آپ نے فرمایا "ابو فلاں کے لئے لکھ دو۔"[1]

محدثین نے ان دونوں روایتوں میں تطبیق اس طرح پیدا کی ہے کہ آپ نے جس زمانہ میں کتابت حدیث کی ممانعت فرمائی تھی وہ نزول وحی کا زمانہ تھا۔ اگر قرآن مجید کی طرح حدیث کی کتابت کا بھی اہتمام کیا جاتا تو اندیشہ تھا کہ دونوں میں التباس واقع ہو جائے۔ پھر جب التباس کا اندیشہ جاتا رہا تو آپ نے لکھنے کی اجازت دیدی۔ بہرحال یہ ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں آپ کے اقوال و افعال کو قلمبند کرنے کا عام اہتمام نہیں تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کی وفات کے بعد صحابہ کرام کے پاس بجز قرآن کے کوئی دوسرا صحیفہ نہیں تھا۔ کسی ضرورت کے وقت اگر وہ کوئی حدیث بیان بھی کرتے تھے تو اپنے حافظہ سے بیان کرتے تھے۔

---

[1] بخاری کتاب الدیات باب من قتل لہ۔

حافظ ذہبی نے حاکم سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔ جس میں پانچسو احادیث تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک شب حضرت عائشہؓ نے انھیں دیکھا کہ کرب و اضطراب سے کروٹیں بدل رہے تھے۔ انھیں اس سے رنج ہوا پوچھا "آپ کو کوئی تکلیف ہے؟" صبح ہوئی تو فرمایا "بیٹی! احادیث کا جو مجموعہ تمہارے پاس ہے ذرا لانا" حضرت عائشہؓ نے اس کو پیش کیا۔ آپ نے آگ منگا کر اسے جلا ڈالا۔ وجہ پوچھی گئی تو فرمایا "میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں مرجاؤں اور یہ مجموعہ میرے پاس ہو اور اس میں ایسے شخص کی احادیث بھی ہوں جس کو میں نے ثقہ سمجھا ہو اور وہ دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی نہ ہوں تو اس کی نقل کی ذمہ داری مجھ پر ہی ہوگی۔ لیکن یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ خود حافظ ذہبی اس کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں فھذا لا یصح یہ روایت صحیح نہیں ہے۔[1]

بعض خاص صحیفے | بخاری کی ایک روایت سے صرف حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ وہ حدیث کی کتابت کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ جو کثرت روایت میں مشہور تھے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بجز عبداللہ بن عمرؓ کے مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا وہ احادیث قلمبند کرتے تھے اور میں ان کو زبانی یاد رکھتا تھا۔[2]

بعض حفاظ نے لکھا ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ نے علم الفرائض میں کوئی کتاب لکھی تھی[3] لیکن اصل یہ ہے کہ عہدِ صحابہ میں جن صحیفوں کا ذکر ملتا ہے وہ زیادہ تر زکوٰۃ وغیرہ کے خاص خاص احکام سے متعلق تھے ورنہ پہلی صدی ہجری کے ختم تک نہ باقاعدہ تدوینِ حدیث کی طرف توجہ کی گئی اور نہ کہیں اس کا اہتمام کیا گیا۔ ابوجحیفہ کی روایت ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ حضرت علیؓ سے دریافت کیا۔

هل عندكم كتاب   کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج اص ۵ [2] بخاری باب کتابۃ العلم [3] توجیہ النظر الی اصول الاثر ص ۸۔

فرمایا "لا الا کتاب اللہ او فہم اُعطیہ نہیں صرف کتاب اللہ ہے یا وہ سمجھ جو کسی

رجل مسلم او ما فی ھذہ الصحیفۃ مسلمان کو عطا کی گئی ہو یا وہ جو اس صحیفہ میں ہے۔

ابو جحیفہ نے پوچھا اس میں کیا ہے؟ بولے

العقل و فکاک الاسیر یعنی دیت کے اور قیدی کو رہا کرانے کے احکام اور ایک یہ حکم کہ کوئی

ولا یقتل مسلم بکافر[1] مسلمان کسی کافر کے قصاص میں قتل نہ کیا جائے۔

غرضکہ پہلی صدی ہجری تک یہی حال رہا۔[2]

تحریک تدوین حدیث | جب عمر بن عبد العزیزؒ سریر آرائے خلافت ہوئے اور آپ نے دیکھا کہ جن بزرگوں کے سینوں میں اقوال و افعال نبویؐ کا ذخیرہ موجود ہے یکے بعد دیگرے اٹھتے چلے جا رہے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ آنے والی نسلیں ان سرچشمہائے سعادت سے بالکل محروم رہ جائیں تو آپ نے ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم کو لکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حدیث اور سنت آپ کو ملے اس کو لکھ لیجئے میں ڈرتا ہوں کہ کہیں علم مٹ نہ جائے اور علما فنا نہ ہو جائیں۔ اور آپس میں مجالست کرو تاکہ جو شخص نہیں جانتا وہ بھی جان جائے۔[3]

ابوبکر بن محمد انصار مدینہ میں سے تھے۔ سلیمان بن عبد الملک اور عمر بن عبد العزیزؒ کی طرف سے مدینہ کے گورنر تھے۔ سنہ ۱۲۰ھ میں وفات پائی۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ سنہ ۹۹ھ سے رجب سنہ ۱۰۱ھ تک خلیفہ رہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تدوین حدیث کی تحریک سنہ ۱۰۰ھ کے لگ بھگ شروع ہو گئی تھی۔ اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے حکم سے ابن شہاب زہری اور بعض اور

---

[1] بخاری باب کتابت العلم [2] ادارہ معارف اسلامیہ لاہور کے دوسرے اجلاس منعقدہ لاہور میں ڈاکٹر زبیر صدیقی کلکتہ یونیورسٹی نے "تدوین حدیث عہد نبوت میں" کے عنوان سے انگریزی زبان میں ایک نہایت محققانہ اور قابل قدر مضمون پڑھا تھا جو ادارہ کی رپورٹ میں شائع ہو چکا ہے اس میں موصوف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ درحقیقت تدوین احکام کا کام سرکار رسالتمآب کے عہد میں ہی شروع ہو گیا تھا لیکن افسوس ہے کہ ہم پورے مضمون کے ساتھ اتفاق نہیں کر سکتے۔ موصوف جن کو مجموعہ ہائے احادیث کہتے ہیں وہ دراصل صحف تھے جن میں بعض خاص خاص احکام درج تھے۔ [3] بخاری کتاب العلم کیف یقبض العلم۔

محدثین عصر نے حدیث کے مجموعے مرتب کئے تھے۔

درسِ حدیث دوسری صدی ہجری کے نصفِ اول کے ہوتے ہوتے درسِ حدیث کا عام چرچا ہو گیا۔ مدینہ، بصرہ، کوفہ، شام میں اس کے مستقل مراکز قائم تھے۔ جنہوں نے حضرت عکرمہ مولیٰ ابن عباس، نافع مولیٰ ابن عمر، سعید بن جبیر، مجاہد بن جبیر، طاؤس بن کیسان، شہاب الدین زہری امام نخعی وغیرہ ایسے ائمہ حدیث وارباب علم وفضل پیدا کئے۔

عہدِ بنی عباس میں تدوینِ حدیث کا آغاز بنو عباس کے عہدِ حکومت میں جب علم وفن کا چرچا عام ہوا اور علوم وفنون کی تدوین شروع ہوئی تو اب علماء اسلام نے سب سے پہلے مختلف شہروں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال اور آپ کی سیرتِ مقدسہ مدون کرنے کی طرف توجہ مبذول کی چنانچہ مکہ میں ابنِ جریج المتوفی ۱۵۰ھ نے مدینہ میں محمد بن اسحاق (۱۵۱ھ) اور امام مالک بن انس (۱۷۹ھ) نے بصرہ میں ربیع بن صبیح (۱۶۰ھ) سعید بن عروبہ (۱۵۶ھ) اور حماد بن سلمہ (۱۶۷ھ) نے کوفہ میں سفیان الثوری (۱۶۱ھ) نے شام میں امام اوزاعی (۱۵۶ھ) نے یمن میں معمر (۱۵۳ھ) نے۔ خراسان میں عبد اللہ بن المبارک (۱۸۱ھ) نے اور مصر میں لیث بن سعد (۱۷۵ھ) نے الگ الگ مجموعہائے حدیث مدون کئے۔ ابنِ جریج کی وفات ۱۵۰ھ میں ہو گئی تھی اس لئے غالب یہ ہے کہ اس کارِ خیر میں سبقت کا سہرا انھیں کے سر ہو گا۔[1]

ان ائمہ حدیث نے یہ مجموعے اس جذبہ کے ماتحت مرتب کئے تھے کہ علماء کرام فنا ہو رہے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ علم بھی بالکل فنا ہو جائے۔ اس لئے انھوں نے ان کتب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال کے ساتھ صحابۂ کرام کے اقوال اور تابعین کے فتاوے بھی شامل کر دیئے۔ ان مجموعوں میں سے آج کل صرف مؤطا امام مالک پایا جاتا ہے جس کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ جامعینِ حدیث نے اقوالِ صحابہ کی حفاظت میں بھی وہی اہتمام کیا جو انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال کی

---

[1] ضحی الاسلام ج ۲ ص ۱۰۷۔

تدوین وحفاظت میں کیا تھا۔

دوسری صدی ہجری کے ختم پر بعض ائمہ کو خیال ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو اقوالِ صحابہ اور فتاوی تابعین سے الگ کر کے ایک علیحدہ مجموعہ میں محفوظ کر دینا چاہیے چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر متعدد علماء نے مسانید لکھیں جن میں مشہور یہ ہیں۔ عبید اللہ بن موسی العبسی الکوفی، مسدد بن مسرہد البصری، اسد بن موسی الاموی، نعیم بن حماد الخزاعی نزیل مصر۔ ان کے نقش قدم پر دوسرے علماء یا اعلام بھی چلے اور انھوں نے بھی مسانید لکھیں۔ اس سلسلہ میں امام احمد بن حنبل اسحق بن راھویہ اور عثمان بن ابی شیبہ[1] کے اسماء گرامی زیادہ نمایاں ہیں۔

کتب حدیث کی ترتیب میں اختلاف

سب سے پہلے حدیث کے جو مجموعے مرتب ہوئے ان کی ترتیب ابواب فقہ کے مطابق رکھی گئی تھی۔ مثلاً کتاب الطہارۃ لکھکر ایک عنوان مقرر کر دیا، اور پھر طہارت سے متعلق جتنی احادیث تھیں ان سب کو اس باب میں یکجا کر دیا۔ اس کے برخلاف بعض علماء نے احادیث کی تدوین رواۃ کے ناموں سے کی۔ مثلاً ابوہریرہ سے جتنی روایتیں منقول ہیں وہ طہارت سے متعلق ہوں یا صوم سے سب کو ایک جگہ جمع کر دیا۔ پہلی قسم کی کتب حدیث کو علماء فن کی اصطلاح میں کتب السنن اور دوسری قسم کی کتب کو مسند کہتے ہیں ان کے علاوہ بعض علماء تھے جنھوں نے احادیث کو سنن اور مسانید دونوں کے طریقوں پہ جمع کیا ان علماء میں ابوبکر بن ابی شیبہ کا نام زیادہ مشہور ہے۔[2]

کتب حدیث میں فرق مراتب

پچاس سال کی مدت میں جو کتابیں لکھی گئیں وہ سب مرتبہ کے لحاظ سے برابر نہیں ہو سکتی تھیں کیونکہ بعض جامعین حدیث کو ایسے مواقع میسر تھے کہ وہ صحت کے متعلق خوب جانچ پڑتال کر سکتے تھے اور پھر ان کا جو سلسلۂ اسناد تھا وہ سب کے زیادہ قوی اور معتبر تھا ان کے برخلاف دوسرے علماء وہ تھے جنھوں نے کچھ زیادہ تنقید سے کام نہیں لیا اور صحیح وسقیم میں فرق کئے بغیر احادیث قلمبند کر دیں۔

---

[1] مقدمہ فتح الباری ص ۴۔ [2] ایضاً

حافظ ابن حجر امام بخاری کے عہد سے پہلے کی کتابوں کا ذکر کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:۔

"امام بخاری نے جب ان سب تصانیف کو دیکھا۔ ان سے سیراب ہوئے اور ان کی خوشبو سونگھی تو انھوں نے دیکھا کہ وضع کے ماتحت ان میں صحیح احادیث بھی ہیں اور سقیم بھی بلکہ اکثر مجموعے ایسے تھے جن میں ضعیف حدیثیں موجود تھیں۔ یہ دیکھ کر انھوں نے عزم کر لیا کہ وہ صحیح احادیث کو غیر صحیح احادیث سے الگ کر کے ایک مجموعہ میں شامل کر دیں گے"[1]

تنقید احادیث | تیسری صدی ہجری کا زمانہ تدوینِ حدیث کی تاریخ میں سب سے زیادہ اہم ہے کیونکہ اس زمانہ میں حدیث کی سب سے زیادہ اہم کتابیں تالیف ہوئیں۔ تنقیدِ رُواۃ کے اصول متعین ہوئے۔ جرح و تعدیل کے اسباب مقرر کئے گئے اور اب تک جس طرح متنِ حدیث کے یاد کرنے، پرکھنے اور اس کو سمجھنے کا اہتمام کیا جاتا تھا اس کے ساتھ اسانید کو محفوظ رکھنے اور ان کی صحت و سقم کی تحقیق و تفتیش کا بھی اہتمام ہونے لگا اور علم اسماء الرجال کے نام سے ایک مستقل علم کی بنیاد پڑی۔ اس عہد میں امام بخاری المتوفی ۲۵۶ھ نے الجامع الصحیح، امام مسلم المتوفی ۲۶۱ھ نے اپنی صحیح مرتب کی۔ اور ابن ماجہ المتوفی ۲۷۳ھ اور ابوداؤد المتوفی ۲۷۵ھ نے اپنی اپنی سنن، امام ترمذی المتوفی ۲۷۹ھ نے اپنی جامع اور امام نسائی المتوفی ۳۰۳ھ نے اپنی سنن کو مرتب کیا۔ یہ چھ کتابیں حدیث کی سب سے زیادہ مستند اور صحیح کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔ اور ان کو "صحاحِ ستّہ" کہتے ہیں۔

فنِ تنقیدِ حدیث و اسناد کیوں ایجاد کیا گیا۔ اس کی بنیاد روایت و درایت کے کن اصول پر ہے؟ اور اس فن نے صحت و اعتبارِ حدیث کا پایہ کتنا بلند کر دیا؟ ان سب باتوں کو معلوم کرنے کے لئے پہلے "وضعِ حدیث" کی مختصر رُوداد سن لینی چاہئے تاکہ محدثین کرام کی کوششوں کی پوری قدر ہو سکے۔

---

[1] مقدمہ فتح الباری ص ۴۔

وضعِ حدیث کا فتنہ اور اس کا انسداد

جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام و تابعینِ عظام کے عہد میں احادیث کی باقاعدہ تدوین نہیں ہوئی جو کچھ حدیثیں تھیں زبانوں پر تھیں اور اسی طرح ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہوتی رہتی تھیں۔ اس تقریب سے منافقوں اور دشمنانِ اسلام کو احادیث وضع کرنے کا موقع ہاتھ آگیا۔ ان لوگوں نے مسلمانوں میں اختلاط وارتباط پیدا کر کے احادیثِ موضوعہ کی نشر و اشاعت شروع کی اور اس طرح اسلام کو نقصان پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ ابنِ عدی کہتے ہیں: عبدالکریم بن ابی العوجاء کو قتل کرنے کے لئے بھیجا گیا تو اس نے کہا میں نے چار ہزار احادیث جن میں حرمت و حلت کے احکام ہیں وضع کر کے لوگوں میں پھیلا دی ہیں[1]۔

وضاعینِ حدیث کے مختلف طبقے

علامہ سیوطی نے ابن جوزی سے نقل کیا ہے کہ جن لوگوں کی احادیث میں جھوٹ، وضع اور قلب پایا جاتا ہے ان کی چند قسمیں ہیں بعض وہ لوگ ہیں جن پر زہد غالب تھا وہ احادیث کی حفاظت نہیں کر سکے یا ان کی کتابیں ضائع ہو گئیں۔ یحییٰ بن سعید القطان سے روایت ہے کہ میں نے جھوٹ اس جماعت سے زیادہ کسی میں نہیں پایا جو اپنے تئیں خیر اور زہد کی طرف منسوب کرتی ہے[2]۔

بعض وہ لوگ تھے جو اگرچہ ثقہ تھے لیکن ان کی عقلوں میں فتور آگیا تھا اور وہ پھر بھی روایتِ حدیث سے باز نہیں آتے تھے۔ کچھ ایسے تھے جنہوں نے کوئی غلط روایت نقل کر دی، بعد میں انہیں اپنی غلطی کا علم بھی ہو گیا لیکن انا و سخن پروری انہوں نے رجوع نہیں کیا۔ ان

---

[1] تذکرۃ الموضوعات ص ۷، [2] مقدمہ صحیح مسلم

مختلف لوگوں کے علاوہ ایک زندیقوں کا طبقہ تھا جو قصداً شریعت کو برباد کرنے اور اسلام میں فتنہ و شر کا دروازہ کھولنے کی غرض سے احادیث وضع کرتا تھا۔ ان زنادقہ میں کچھ لوگ ایسے جری بھی تھے جو موقع پاکر اپنے شیخ کی کتاب اٹھا لیتے اور اس میں من گھڑت حدیثیں بھی شامل کر دیتے تھے۔ کچھ لوگ ایسے تھے جو کسی خاص عقیدہ و خیال کے پابند تھے اور اس کو لوگوں میں مقبول بنانے کے لئے احادیث وضع کرتے تھے۔ ابن لہیعہ فرماتے ہیں مجھ سے ایک خارجی العقیدہ شیخ نے کہا جس نے آخر میں توبہ کر لی تھی کہ ہم جب کسی امر کا ارادہ کرتے تھے تو فوراً اس کے لئے ایک حدیث وضع کر لیتے تھے۔ حماد بن سلمہ فرماتے ہیں میں نے ایک رافضی سے سنا وہ کہتا تھا کہ جب ہم کسی چیز کو اچھا سمجھتے تھے تو اس کے لئے ایک حدیث وضع کر لیتے تھے۔ محمد بن القاسم الطالکانی فرقہ مرجیہ کا سردار تھا۔ اپنے عقیدہ کے مطابق کثرت سے احادیث وضع کرتا تھا۔ ان کے سوا کچھ وہ لوگ تھے جو ترغیب و ترہیب کے لئے وضع حدیث کو جائز سمجھتے تھے اور وہ ایسا کرتے بھی تھے۔[1]

اسباب وضع حدیث | وضع حدیث کے اسباب مختلف تھے۔ اجمالاً انہیں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔

(۱) سیاسی جھگڑے۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے اختلاف کی وجہ سے خوارج اور شیعہ کے جو دو فرقے پیدا ہو گئے تھے ان کو اپنے اپنے عقیدہ میں اتنا غلو تھا کہ حضرت علیؓ اور معاویہؓ کی شان میں بے تکلف احادیث وضع کرتے اور من کذب علی متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار کی وعید کی ذرا پرواہ نہیں کرتے تھے۔ پھر بنو امیہ اور بنو عباس میں جو مستقل سیاسی رقابت قائم ہو گئی تھی اس نے اس چنگاری کو ہوا دیکر دہکتی ہوئی آگ بنا دیا۔ اسی قبیل میں وہ احادیث شامل ہیں جو عربی عصبیت اور عجمی خود پرستی کی کشمکش کے باعث اختراع کی گئیں۔

(۲) دوسری صدی کے وسط میں کلامی اور فقہی مسائل کا زور ہوا تو اپنی وجاہت علمی کو نمایاں کرنے کے لئے بعض لوگوں نے قصداً احادیث وضع کیں اور چونکہ مسلمان ہر مسئلہ کا ثبوت

---

[1] اللآلی المصنوعہ فی الاحادیث الموضوعہ ج ۲ ص ۴۶۸ - ۴۶۹۔

قرآن و حدیث سے چاہتے تھے اس لئے بعض وضاعین نے اپنے نظریہ کی تائید کے لئے جان بوجھ کر حدیثیں وضع کیں اور ان کا عام چرچا کیا۔

(۳) شخصی حکومت کے استبداد کی وجہ سے بعض لوگ ایسی حکومانہ ذہنیت رکھتے تھے کہ بادشاہ کو خوش کرنے کے لئے سرکار دو عالم پر تہمت طرازی سے بھی باز نہیں آتے تھے۔

غیاث بن ابراہیم کے متعلق مشہور روایت ہے کہ وہ ایک مرتبہ مہدی بن منصور کے پاس آیا مہدی کو کبوتر بازی کا بہت شوق تھا۔ غیاث نے یہ دیکھتے ہی اس کو خوش کرنے کے لئے حدیث وضع کردی لا سبق الا فی خف او حافر او جناح۔ مہدی نے اس وقت تو خوش ہو کر غیاث کو دس ہزار درہم دلا دیئے۔ لیکن جب وہ جانے لگا تو مہدی نے کہا " میں گواہی دیتا ہوں کہ تیری گدی اس شخص کی سی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط احادیث منسوب کرتا ہو، رسول اللہ نے او جناح نہیں فرمایا ہے تو نے ہم سے تقرب حاصل کرنے کے لئے اس لفظ کا اضافہ کر دیا ہے[۱]۔

غرض یہ ہے کہ یہ اسباب تھے جن کی وجہ سے دشمنانِ اسلام نے احادیثِ موضوعہ کا انبار لگا دیا اب سوال یہ ہے کہ کیا ان وضاعین کی نامراد کوششوں کی وجہ سے حدیث کا تمام ذخیرہ ناقابلِ اعتبار و استناد قرار دیا جا سکتا ہے؟ کیا ان فتنہ پردازوں کی سرکوبی کے لئے ائمۂ دین اور علماءِ اسلام نے جو عدیم النظیر کوششیں کی ہیں وہ سب بے کار و بے فائدہ رہیں؟ کیا یہ صحیح ہے کہ ان دجاجلۂ امت کا جادو چل گیا اور اب ہم اس قابل نہیں ہیں کہ کسی ارشادِ نبوی پر بھروسہ کر سکیں؟ کیا یہ درست ہے کہ وضع و کذب کے دریا میں حقانیت و صداقت کے چند قطرے ایسے رَل مِل گئے ہیں کہ اب ان کا کہیں سراغ نہیں لگ سکتا؟ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید نے جس ذاتِ گرامی کو خود اسوۂ حسنہ کہا تھا ان افترا پرداز افسانوں کی ملعون حرکات کے باعث اس کے اقوال و افعال اب ایسے تاریک پردوں میں مستور ہو گئے ہیں کہ ہم ان سے کوئی

---

[۱] شرح مسلم الثبوت جزء ۲ ص ۱۵۲ و نخبۃ الفکر۔

روشنی حاصل کر کے اپنے ظلمت کدۂ حیات کو روشن نہیں کر سکتے۔ یہ جو قرآن نے لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ کا اعلان کر کے ہم کو اسوۂ نبوی کی پیروی کی دعوت دی تھی یہ سراسر بے کار ہی رہی ؟۔

عہدِ صحابہ میں عدم کتابت حدیث کی وجہ

اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے ہم کو پہلے ان روایات و آثار پر ایک نظر ڈالنی چاہیے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام احادیث کے ساتھ کتنا اعتنا کرتے تھے۔ اور ان کو کس طرح حرزِ جان بنا کر رکھتے تھے۔ اس قسم کی روایات پہلے گذر چکی ہیں یہاں ان کے اعادہ کی چنداں ضرورت نہیں البتہ اس موقع پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صحابہ کو احادیث کا اتنا اہتمام تھا تو انھوں نے احادیث کی کتابت کیوں نہیں کی ؟ اور کسی نے ایسا کرنا چاہا تو اسے اس کی اجازت کیوں نہیں ملی ؟

جواب یہ ہے کہ فرطِ احتیاط کے باعث صحابہ سمجھتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم ان کو لکھیں اور کوئی شخص ان میں کمی بیشی کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس کا غلط انتساب کر دے تو اس کی ذمہ داری لکھنے والے پر عائد ہوگی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اجلۂ صحابہؓ چاہتے تھے کہ قرآن و حدیث میں مرتبہ کے اعتبار سے فرق باقی رہے۔ کتب میں مدوّن ہو جانے کے باعث ایسا نہ ہو کہ لوگ قرآن کو بھول جائیں اور اپنی تمام توجہ حدیث پر مبذول کر دیں۔ روایات و آثار سے ان دونوں باتوں کی تائید ثابت ہوتی ہے۔ حضرت علیؓ نے ایک مرتبہ خطبہ میں ارشاد فرمایا۔

"ہر وہ شخص جس نے کچھ احادیث لکھ رکھی ہوں میں اس کو قسم دیتا ہوں کہ ان کو رجوع کرے اور انھیں مٹا دے"

پھر فرمایا

فانما ھلک الناس حیث یتبعوا احادیث علماءھم وترکوا کتاب ربھم۔	لوگوں نے جب کبھی اپنے علماء کی باتوں کا اتباع کیا اور اپنے رب کی کتاب چھوڑ دی ہلاک ہوگئے؛

(اس روایت میں احادیث علماءھمؓ کے الفاظ خاص طور پر قابل غور ہیں

حضرت ابو سعید خدری ؓ سے کسی نے کہا کہ آپ جو احادیث نقل کرتے ہیں کیا ہم ان کی کتابت نہ کریں؟ فرمایا "ہم تم کو کتابت نہیں کرائیں گے تم ہم سے روایات اسی طرح بیان کرو جس طرح ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں۔"

قرنِ اول میں کتابتِ حدیث سے اجتناب، حدیث سے بے اعتنائی پر نہیں بلکہ روایت حدیث میں کمال احتیاط پر مبنی تھا۔ علامہ قرطبیؒ نے امام مالکؒ کا ایک قول نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

لم یکن القوم یکتبون انما کانوا	لوگ پہلے لکھتے نہیں تھے۔ صرف یاد رکھتے
یحفظون فمن کتب منھم الشیٔ	تھے۔ ان میں سے اگر کوئی۔۔ کچھ لکھتا بھی تھا
فانما کان یکتبہ لیحفظہ فاذا	تو صرف یاد کرنے کے لئے لکھتا تھا۔ یاد ہو جانے
حفظہ محاہ۔ [1]	کے بعد اسے مٹا ڈالتا تھا۔

اس مقام پر ایک اور روایت کا نقل کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے جس سے عدم کتابت حدیث کے وجوہ و اسباب پر کامل روشنی پڑتی ہے۔

عبدالرحمٰن بن الاسود اپنے والد سے روایت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں "ایک مرتبہ مجھے اور حضرت علقمہ کو کہیں سے ایک صحیفہ مل گیا۔ ہم دونوں اسے لیکر غروب آفتاب کے وقت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس گئے اور دروازہ پر بیٹھ گئے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے جاریہ سے فرمایا دیکھنا دروازہ پر کون ہے؟ جاریہ بولی علقمہ اور اسود۔ حضرت ابن مسعودؓ نے ہم کو اجازت دیدی' گھر میں داخل ہو کر ہم نے وہ صحیفہ دکھایا اور کہا کہ یہ حدیث حسن ہے۔ حضرت عبداللہ نے جاریہ کو طشت میں بھر کر پانی لانے کا حکم دیا۔ جاریہ نے حکم کی تعمیل کی۔ آپ نے فوراً پانی سے بدست خود اس صحیفہ کو مٹانا شروع کر دیا اور نحن نقص علیک احسن القصص پڑھنے لگے۔ ہم نے کہا ذرا اس کو تو دیکھ لیجئے اس میں ایک عجیب حدیث ہے۔ لیکن حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ

---

[1] یہ سب روایتیں میں نے جامع بیان العلم وفضلہ ج ا ص ۶۳ سے لی ہیں۔

پھر بھی نہ مانے اور اس صحیفہ کو مٹاتے ہی رہے اور فرمایا۔

ان ھذہ القلوب اوعیۃ فاشغلوھا یہ دل برتن ہیں۔ ان کو تم قرآن مجید سے پر کرو

بالقرآن ولا تشغلوھا بغیرہ اور اس کو دوسری چیز سے مت بھرو۔

ابو عبید جو اس قصہ کے ایک راوی ہیں اور سند میں مذکور بھی ہیں کہتے ہیں "معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحیفہ اہل کتاب سے لیا گیا تھا اس لئے حضرت ابن مسعودؓ نے اس کو دیکھنا بھی مکروہ سمجھا"[1]

غرض یہ ہے کہ یہ وجوہ تھے جن کی بنا پر عہد صحابہ میں ایک طرف کتابت و تدوین حدیث نہیں ہوئی اور دوسری طرف انھوں نے احادیث کے قبول کرنے اور ان کی جانچ پڑتال کرنے میں کافی اہتمام کرنا شروع کر دیا تاکہ احادیث صحیحہ غیر صحیحہ سے متمایز ہو جائیں۔

قبول حدیث میں صحابہ کی احتیاط

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں "جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ نہیں باندھا جاتا تھا۔ ہم احادیث قبول کرتے تھے لیکن جب لوگ اس طرح کی باتیں کرنے لگے تو ہم نے آپ سے روایت کرنا ترک کر دیا" ایک اور حدیث اس سے بھی زیادہ واضح ہے۔ بشیر العدوی کہتے ہیں "میں ایک مرتبہ حضرت ابن عباسؓ کے پاس آیا اور ان کے سامنے روایت بیان کرنے لگا۔ لیکن حضرت ابن عباسؓ نے اس پر کوئی توجہ نہیں کی۔ میں نے کہا ابن عباس! میں دیکھتا ہوں کہ آپ میری حدیث نہیں سنتے" فرمایا! ایک زمانہ تھا کہ جب کوئی شخص ہمارے سامنے قال رسول اللہ کہتا تو ہماری نگاہیں فوراً اس کی طرف اٹھ جاتیں اور ہم بڑی توجہ سے وہ روایت سنتے تھے لیکن اب جبکہ لوگوں نے غلط ملط کر دیا ہے ہم ان سے صرف وہی روایتیں قبول کرتے ہیں جنھیں ہم جانتے ہیں"[2]

اس احتیاط کی وجہ سے اگر کوئی صحابی ان میں سے کسی کے پاس کوئی کتاب لاتا تو وہ اس میں جتنے حصہ کو صحیح سمجھتے رہنے دیتے اور باقی کو قلمزد کر دیتے۔

---

[1] جامع بیان العلم وفضلہ ج ۱ ص ۶۶ [2] صحیح مسلم باب النہی عن الروایۃ عن الضعفاء۔

سفیان بن عینیہ سے روایت ہے کہ "ایک مرتبہ حضرت ابن عباسؓ کے پاس ایک شخص ایک کتاب لایا اس میں حضرت علیؓ کا کوئی فیصلہ تھا۔ حضرت ابن عباسؓ نے تھوڑے سے حصہ کو رہنے دیا اور باقی کو مٹا دیا" [1]

بے تحقیق روایت پر وعید | کسی روایت کو سننے کے بعد اس کو اگر بیان کرنا چاہتے تو پہلے اس کی خوب چھان بین کر لیتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی

کفیٰ بالمرء کذبا ان یحدث	ایک آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے یہی کافی ہے
بکل ما سمع۔ [2]	کہ وہ ہر اس چیز کو بیان کر دے جو سنے۔

ان کے پیش نظر رہتا تھا۔ اس کے علاوہ آپ نے یہ پیش گوئی بھی کی تھی۔

سیکون فی اٰخر امتی اناس یحدثونکم	آخر امت میں ایسے لوگ آئیں گے جو تم سے حدیثیں
ما لم تسمعوا انتم ولا اٰباؤکم	بیان کریں گے جن کو نہ تم نے سنا ہوگا اور نہ تمہارے
فایاکم وایاھم [3]	آباء نے تم ان سے بچتے رہنا۔

حضرت عبداللہ فرماتے تھے۔

ان الشیطان لیتمثل فی صورۃ	شیطان مرد کی صورت میں متشکل ہو کر ایک
الرجل فیأتی القوم فیحدثھم	جماعت کے پاس آئیگا اور ان سے جھوٹ حدیث
بالحدیث من الکذب فیتفرقون	بیان کریگا جس کی وجہ سے وہ لوگ متفرق ہو جائیں
فیقول الرجل منھم سمعت	گے اور ان میں کا ایک شخص کہے گا کہ میں نے یہ حدیث
رجلا اعرف وجھہ ولا ادری	ایسے شخص سے سنی ہے جس کا چہرہ میں پہچانتا ہوں
ما اسمہ یحدث [4]	لیکن اس کا نام نہیں جانتا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ صحت حدیث کی تحقیق میں بہت اہتمام کرتے تھے۔

---

[1] صحیح مسلم باب الروایۃ عن الضعفاء۔ [2] ایضاً۔ [3] صحیح مسلم باب النہی عن الروایۃ عن الضعفاء۔ [4] صحیح مسلم باب الروایۃ عن الضعفاء۔

جب تک انھیں راوی سے پورا تعارف نہ ہوتا وہ کسی حدیث کو یوں ہی قبول نہ کرتے تھے۔

کثرت روایت سے اجتناب | جو لوگ کثرت سے روایت کرتے تھے صحابۂ کرام انھیں اچھا نہیں سمجھتے تھے کیونکہ ایسے حضرات سے کسی روایت کے باب میں غیر محتاط رہنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

طاہر جزائری لکھتے ہیں۔

لانہ لاکثار مظنۃ للخطاء والخطاء	کیونکہ کثرت روایت سے خطا کا احتمال ہوتا ہے
فی الحدیث عظیم الخطر[1]	اور حدیث میں خطا بڑے خطرہ کا سبب ہوتی ہے۔

حضرت ابوہریرۃ کثیر الروایۃ صحابی تھے حضرت عمرؓ نے ان پر سختی کی کہ وہ کثرت سے روایت نہ کیا کریں تو حضرت ابوہریرہ نے بطور معذرت فرمایا۔

ان الناس یقولون اکثر ابو ھریرۃ	لوگ کہتے ہیں کہ ابوہریرہ کثرت سے روایت کرتا ہے
ولولا ایتان فی کتاب اللہ ما حدثت	اگر قرآن مجید میں دو آیتیں نہ ہوتیں تو میں کوئی حدیث
حدیثا ثم یتلوا ان الذین یکتمون	روایت نہ کرتا اس کے بعد آپ آیت ان الذین
ما انزلنا من البینات الی قولہ الرحیم	یکتمون الخ پڑھتے پھر فرماتے ہمارے بھائی
ان اخواننا من المھاجرین کان	مہاجرین بازار کے لین دین میں لگے رہتے تھے،
یشغلھم الصفق بالاسواق	اور ہمارے بھائی انصار اپنے ملی معاملات میں
وان اخواننا من الانصار کان	مصروف رہتے تھے ان سب کے برخلاف ابوہریرہ
یشغلھم العمل فی اموالھم	پیٹ کو بھرنے کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
وان ابا ھریرۃ کان یلزم رسول اللہ	کے ساتھ رہتا تھا اور جب انصار و مہاجرین
صلی اللہ علیہ وسلم بشبع بطنہ	نہ ہوتے تھے ابوہریرہ ہوتا تھا اور جسے وہ یاد
ویحضر ما لا یحضرون ویحفظ	نہیں کرتے تھے ابوہریرہ یاد کرتا تھا۔
ما لا یحفظون۔[2]	

---

[1] توجیہ النظر الفصل الثالث [2] صحیح بخاری باب حفظ العلم۔

اس احتیاط کی وجہ سے جلیل القدر صحابہ کی ایک جماعت تھی جو بہت کم روایت کرتی تھی ان میں حضرت ابوبکرؓ، زبیرؓ، ابو عبیدہؓ، عباس بن عبدالمطلب رضوان اللہ علیہم اجمعین زیادہ مشہور ہیں اور بعض بعض صحابی تو وہ تھے جو روایت ہی نہیں کرتے تھے مثلاً سعید بن زید بن عمرو بن نفیل۔ حضرت عمرؓ خود بھی روایت کم کرتے تھے اور دوسروں کو بھی قلتِ روایت کی تاکید کرتے تھے۔ مسلمانوں کا ایک لشکر عراق کی طرف روانہ ہوا تو حضرت عمرؓ نے انھیں خطاب کرکے ارشاد فرمایا۔

جودوا القرآن واقلوا الروایۃ	قرآن خوب اچھی طرح پڑھو اور رسول اللہ
عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کم کرو۔

بلکہ بعض اوقات تو غلط احادیث کی اشاعت کے خوف سے روایتِ حدیث کی ہی ممانعت کردیتے تھے چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد لوگوں کو جمع کرکے فرمایا "تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی حدیثیں بیان کرتے ہو جن میں خود مختلف ہوتے ہو، تمہارے بعد جو لوگ آئیں گے وہ اس سے بھی زیادہ اختلاف کریں گے۔ پس رسول اللہ کی حدیث بیان مت کیا کرو اور تم سے کوئی بات دریافت کی جائے تو کہو، ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی کتاب ہے اس کے ہی حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام سمجھو۔"[1]

حدیث پر شہادت پھر ان کے سامنے کوئی معروف ثقہ شخص بھی حدیث بیان کرتا تو اسے بغیر شہادت کے قبول نہیں کرتے تھے۔ شہادت کے بعد اس حدیث کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثبوت قطعی ہوجاتا تو اس پر سختی کے ساتھ عامل ہوتے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس ایک عورت آئی اور عرض کیا کہ فلاں شخص جس کا انتقال ہوگیا ہے میرا نواسہ تھا اور میں اس کی نانی ہوں متوفی کی میراث سے مجھ کو حصہ دلا دیجیے" آپ نے

---

[1] جامع بیان العلم وفضلہ ابن عبدالبر، تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳

فرمایا "تیرے متعلق نہ تو کتاب اللہ میں کچھ ہے اور نہ سنت میں ہونے کا مجھکو علم ہے، لوگوں سے دریافت کروں گا پھر بتاؤں گا۔ آپ نے پوچھا تو حضرت مغیرہ بن شعبہ نے فرمایا "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سامنے نانی کو چھٹا حصہ دلایا ہے" حضرت ابوبکرؓ بولے "تمہارا کوئی شاہد بھی ہے؟" محمد بن مسلمہ نے شہادت دی کہ "ہاں میرے سامنے رسول اللہؐ نے نانی کو چھٹا حصہ دلایا ہے" خلیفہ اول نے یہ سنکر اس عورت کو بھی سدس دلا دیا۔[۱]

صحیح بخاری و مسلم میں ابو سعید الخدریؓ سے روایت ہے ہم ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ابو موسیٰ گھبرائے ہوئے آئے، لوگوں نے اس گھبراہٹ کا سبب پوچھا بولے "میں حضرت عمرؓ کی دعوت پر ان کے مکان پر حاضر ہوا تھا۔ دروازہ پر تین مرتبہ دستک دی جواب نہیں ملا تو واپس چلا آیا۔ اس واقعہ کے بعد ایک ملاقات میں حضرت عمرؓ نے پوچھا تم فلاں دن آئے نہیں؟ میں نے پورا قصہ نقل کر دیا اور ساتھ ہی کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "تم میں سے کوئی شخص کسی کے مکان پر جا کر تین مرتبہ اجازت طلب کرے اور اس کو جواب نہ ملے تو اسے واپس آجانا چاہئے" حضرت عمرؓ یہ سن کر بولے "اس حدیث پر اپنا کوئی گواہ لیکر آؤ ورنہ اچھا نہیں ہوگا" اہل مجلس نے کہا "ہم میں سب سے چھوٹا اس کی شہادت دیگا۔ چنانچہ میں (ابو سعید الخدری) اٹھا اور حضرت عمرؓ کے روبرو حاضر ہو کر شہادت پیش کی خلیفہ ثانی بولے" ابو موسیٰ! میں تم کو متہم نہیں کرتا (ناقابل اعتبار نہیں سمجھتا) لیکن یہ معاملہ حدیث کا تھا اس لئے گواہ کی ضرورت تھی۔[۲]

مسور بن مخرمہ کا بیان ہے "ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے ایک ساقط بچہ کے بارہ میں مشورہ کیا، مغیرہ بولے "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لونڈی سے متعلق یہ فیصلہ کیا ہے" حضرت عمرؓ نے فرمایا "اگر تم سچے ہو تو اس پر شہادت پیش کرو" محمد بن مسلم بولے "میں شہادت دیتا ہوں کہ بیشک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فیصلہ کیا تھا"[۳]

ایک واقعہ اس سے بھی زیادہ صریح ہے حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ مسجد کی توسیع کے لئے

---

[۱] مستدرک حاکم و ابوداؤد باب میراث الجدہ [۲] صحیح بخاری باب التسلیم والاستئذان ثلاثا [۳] ابوداؤد باب دیۃ الجنین

حضرت عباسؓ سے زمین طلب کی انھوں نے انکار کر دیا اور حدیث بیان کی کہ آپ زیادتی نہیں کر سکتے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اس پر گواہ پیش کیجئے ورنہ اچھا نہیں ہوگا، حضرت عباسؓ نے ایک جماعت انصار سے اس کا ذکر کیا۔ حضرت عمرؓ کے سامنے ان لوگوں نے تصدیق کی کہ ہاں یہ حدیث صحیح ہے خلیفۂ دوم نے یہ سنکر فرمایا۔

انی لم اتھمک ولکنی اجببت	میں آپ کو ناقابل اعتبار نہیں جانتا لیکن
ان اتثبت [1]	چاہتا تھا کہ تصدیق کر لوں۔

حضرت علیؓ کا بھی معمول تھا کہ ان کے سامنے کوئی شخص حدیث روایت کرتا تو آپ اس سے قسم لیتے تھے۔ [2]

قبول حدیث کے معاملہ میں یوں تو تمام صحابہ اور خصوصاً حضرت ابن عباسؓ، ابن عمرؓ عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت علیؓ سبھی محتاط تھے لیکن اولیت کا سہرا خلیفۂ اول حضرت ابوبکرؓ کے سر ہے۔ چنانچہ علامہ ذہبی فرماتے ہیں۔

وکان اول من احتاط	حضرت ابوبکرؓ قبول اخبار میں سب سے پہلے
فی قبول الاخبار۔	احتیاط کرنے والے ہیں۔

حضرت عمرؓ نے متعدد حدیثوں پر شہادت طلب کر کے تثبت فی النقل کی سنت جاری کر دی اور لوگوں کو یہ بتا دیا کہ ایک حدیث کو دو ثقہ راوی بیان کریں تو وہ قوی ہو جاتی ہے۔

امام ذہبی حضرت عمرؓ کے حالات میں فرماتے ہیں۔

وھو الذی سن للمحدثین	حضرت عمرؓ ہی وہ بزرگ ہیں جنھوں نے محدثین کے لئے
التثبت فی النقل۔	تثبت فی النقل کی سنت جاری کی۔

پھر حضرت ابوموسیٰؓ والا مندرجہ بالا واقعہ نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں

احب عمر ان یتاکد عندہ	حضرت عمرؓ چاہتے تھے کہ ابوموسیٰ کی حدیث

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸ ۔ [2] ایضاً ج ۱ ذکر حضرت علیؓ

خبر ابي موسى بقول صاحب آخر ففي هذا دليل على ان الخبر اذا رواه ثقتان كان اقوى و ارجح مما انفرد به واحد و في ذلك حض على تكثير طرق الحديث لكي يرتقي عن درجة الظن الى درجة العلم اذ الواحد يجوز عليه النسيان والوهم ولا يكاد يجوز ذالك على ثقتين لم يخالفهما احد۔[1]

کسی دوسرے شخص کی شہادت کو مؤکد بنانے، اس بات کی دلیل ہے کہ کسی خبر کو دو ثقہ آدمی بیان کریں تو وہ حدیث منفرد کی بہ نسبت زیادہ قوی اور قابل ترجیح ہو جاتی ہے اور حضرت عمرؓ نے ایسا کر کے طرق حدیث کی کثرت پر بھی لوگوں کو برانگیختہ کیا ہے تاکہ وہ درجۂ ظن سے نکل کر درجۂ علم کی طرف آجائے کیونکہ واحد کے متعلق تو یہ احتمال رہتا ہے کہ اس پر بھول اور وہم طاری ہو گیا ہو لیکن دو ثقہ جن کی کسی نے مخالفت کی ہو ان کی نسبت ایسا احتمال صحیح نہیں ہو سکتا۔

امام ذہبی کا مقصد یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی اس احتیاط پسندی اور تشدد نے محدثین کے لئے شمع ہدایت کا کام کیا یعنی ان کے طرز عمل سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ کوئی حدیث کس وقت قبول کرنی چاہئے اور اس کا معیار کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ حضرت عمرؓ کے عہد میں جو حدیثیں رائج تھیں صحابہ کرام ان کو بے تکلف قبول کر لیتے تھے حضرت معاویہؓ فرماتے تھے۔

عليكم من الحديث بما كان في عهد عمر فانه كان قد اخاف الناس في الحديث عن رسول الله صلى الله عليه وسلم۔[2]

حضرت عمرؓ کے عہد میں جو احادیث رائج تھیں تم ان کو مضبوط پکڑو کیونکہ انھوں نے لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث روایت کرنے سے ڈرایا تھا۔

طلب حدیث کیلئے سفر صحابہ کرامؓ جس طرح بے تحقیق روایت و حدیث کے قبول کرنے سے اجتناب کرتے تھے ان کو اگر معلوم ہوتا کہ کسی دور دراز مقام پر کسی ثقہ کے پاس کوئی حدیث ہے

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۔ [2] ایضاً ج ۱ ص ۷۔

تو اس کو حاصل کرنے کیلئے سفر کے دشوار گذار مرحلوں کو بھی طے کرتے تھے۔ حضرت جابر بن عبد اللہؓ کو معلوم ہوا کہ شام میں (ایک مہینہ کی مسافت پر) عبد اللہ بن انیس کے پاس ایک حدیث ہے، انھوں نے اس کو حاصل کرنے کے لئے ایک اونٹ خریدا اور خدا کا نام لیکر روانہ ہو گئے۔ ایک مہینہ کی مسافت طے کرنے کے بعد منزلِ مقصود پر پہنچے۔ عبد اللہ بن انیس کے مکان پر دستک دی وہ باہر آئے تو انھوں نے گلے لگا لیا آنے کی وجہ دریافت کی بولے "میں نے سنا تھا کہ آپ کے پاس سرکار رسالتمآبؐ کی ایک حدیث ہے، مجھ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اس حدیث کو سُنے بغیر ہی مرجاؤں" پھر وہ حدیث حاصل کی۔[1]

حدیث بیان کرتے وقت دہشت اور خوف

روایتِ حدیث میں صحابۂ کرام کی غایتِ احتیاط و تقویٰ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان میں بعض کا حال یہ تھا کہ صحیح طور پر "قال رسول اللہ" بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ ابو عمر و الشیبانی کہتے ہیں کہ میں حضرت ابن مسعودؓ کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا وہ خوف کے مارے "قال رسول اللہ" نہیں کہہ سکتے تھے اور اگر کہتے بھی تھے تو ان پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا اور یہ کہتے تھے "رسول اللہؐ نے" "اس طرح فرمایا" یا "ایسا ہی فرمایا" یا "تقریباً ایسا ہی فرمایا" یا، یا، یا۔[2]

ان آثار و روایات سے جن کا تاریخی اعتبار بہر حال مسلّم ہے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں۔

(۱) صحابۂ کرام روایت و قبولِ حدیث کے معاملہ میں حد درجہ احتیاط پسند تھے۔

(۲) وضاعین و کذابین کا طبقہ ان کے عہد میمنت عہد میں ہی پیدا ہو گیا تھا۔

(۳) ان لوگوں کے فتنہ و شر سے بچنے اور صحیح احادیث کو محفوظ رکھنے کے لئے صحابۂ کرام نے قبولِ حدیث کے لئے ایک خاص معیار قائم کر لیا تھا کہ جو حدیث اس پر پوری اترتی تھی اس کو بے تکلف قبول کرتے اور اس پر عمل پیرا ہوتے تھے۔

---

[1] امام بخاریؒ نے اس روایت کو تمام و کمال ادب المفرد میں اور امام احمد اور ابو یعلیٰ نے اپنے مسند میں نقل کیا ہے۔ اور امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں بھی باب فی طلب العلم کے ترجمہ میں اس کا ایک ٹکڑا نقل کیا ہے۔ [2] تذکرۃ الحفاظ تذکرہ حضرت ابن مسعود العالم الربانی۔

(۴) صحابۂ کرام کی ان احتیاط پسندیوں کے باعث صحیح وغیر صحیح احادیث میں ایک خط امتیاز کھنچ گیا اور وضاعین وکذابین کے تمام منصوبے پادر ہوا ثابت ہوئے۔

کثرت سے روایت کرنے والے صحابہ

یہ معلوم ہو چکا ہے کہ روایت حدیث میں تمام صحابہ برابر نہیں تھے بعض روایت کم کرتے تھے اور بعض زیادہ جنھوں نے روایات کثرت سے نقل کی ہیں ان میں حسب ذیل بزرگان امت نمایاں شہرت رکھتے ہیں۔

حضرت ابوہریرۃؓ۔ حضرت عائشہؓ ام المومنین۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ۔ عبداللہ بن عباسؓ۔ جابرؓ۔ انس بن مالکؓ۔ حضرت ابوہریرۃؓ کی مرویات کی تعداد ۵۳۷۴ اور حضرت عائشہؓ کی روایتوں کی تعداد ۲۲۱۰ ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور انس بن مالکؓ کی روایتوں کی تعداد بھی قریب قریب حضرت عائشہؓ کے برابر ہے حضرت جابرؓ بن عبداللہ الانصاری کی حدیثیں ۱۵۰۰ سے متجاوز نہیں ہیں۔ حضرت عمرؓ روایت کے معاملہ میں بے انتہا احتیاط پسند تھے آپ کی روایات ۷۰ سے زیادہ نہیں ہیں۔

مستشرقین یورپ جو اسلام پر اعتراض کرنے کے لئے ایک ایک تنکے کا سہارا ڈھونڈتے ہیں انھوں نے حضرت ابوہریرۃؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ پر ان کی کثرت روایت کی وجہ سے بہت لے دے کی ہے اور بعض دریدہ دہنوں نے تو ان دونوں بزرگوں کی شان میں گستاخانہ الفاظ تک دینے سے بھی احتراز نہیں کیا۔ تعجب یہ ہے کہ مصر اور ہندوستان کے بعض ارباب علم تک ان سے متاثر ہو گئے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ان کے متعلق بھی ایک اجمالی گفتگو کر لی جائے۔

حضرت ابوہریرہؓ

حضرت ابوہریرہؓ کا اصلی وطن یمن تھا۔ قبیلہ دوس سے تعلق رکھتے تھے۔ جاہلیت میں نام عبدشمس تھا۔ مسلمان ہونے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کا نام عبدالرحمٰن رکھ دیا تھا۔ والد کا نام صخر تھا۔ ابوہریرہ کنیت تھی۔ ہریرہ عربی زبان میں چھوٹی بلی کو کہتے ہیں۔ اس کنیت کی وجہ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ میں اپنے گھر والوں کی بکریاں چراتا تھا۔ میرے پاس ایک بلی تھی اُسے میں رات کے وقت ایک درخت میں رکھ دیتا تھا۔ اور دن کو اسے اپنے ساتھ چراگاہ لیجاتا جہاں میں اس سے کھیلتا رہتا تھا اس بنا پر لوگ مجھے ابوہریرہ کہنے لگے[1]۔

اسلام اور جستجوئے علم | سنہ ۷ھ میں بمقام خیبر اپنے قبیلہ کی ایک جماعت کے ساتھ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ اقدس پر دولتِ اسلام سے بہرہ اندوز ہوئے۔ آپ کو علم کی بڑی جستجو تھی۔ ہر وقت اسی دھن میں مصروف رہتے تھے اور اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کرنے میں بھی بڑے جری اور بے باک واقع ہوئے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے کسی نے بطور شکایت کہا کہ ابوہریرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت کثرت سے روایت کرتے ہیں؟ فرمایا "پناہ بخدا! ان کی روایات میں کسی قسم کا شک وشبہ نہ کرنا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ سرکارِ رسالتمآب سے سوال کرنے میں بہت جری تھے اور اسی لئے ایسے ایسے سوالات کرتے تھے جن کو ہم لوگ پوچھ بھی نہیں سکتے تھے[3]۔"

---

[1] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۰۷۔ [2] ترمذی مناقب ابوہریرہؓ

[3] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۱۰۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان کی اس جستجوئے علمی اور ذوق تحقیق و تلاش کا اعتراف تھا چنانچہ ایک مرتبہ انھوں نے سید کونین سے دریافت کیا "قیامت کے دن کون خوش نصیب آپ کی شفاعت کا سب سے زیادہ مستحق ہوگا" ارشاد گرامی ہوا "تمہاری حرص علی الحدیث دیکھ کر مجھ کو پہلے سے خیال تھا کہ یہ سوال تم سے پہلے کوئی دوسرا نہیں کرے گا[1]"

حضرت ابوہریرۃؓ کیلئے دعاء نبوی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوہریرہؓ کے ذوق علم کی اس درجہ قدر کرتے تھے کہ ان کے علم کی پختگی اور حافظہ کی قوت کے لئے دعائیں فرماتے تھے۔ زید بن ثابتؓ بیان کرتے ہیں "ایک دن میں اور ابوہریرہ اور ایک اور شخص مسجد میں بیٹھے ذکر خدا و دعا میں مشغول تھے۔ اتنے میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے۔ ہم لوگ خاموش ہوگئے۔ آپ نے فرمایا "اپنا شغل جاری رکھو" یہ سن کر میں اور وہ دوسرا شخص دعائیں کرنے لگے جن پر آپ آمین کہتے جاتے تھے" ہمارے بعد ابوہریرہ نے دعا کی "خدایا جو کچھ میرے ساتھی مجھ سے قبل مانگ چکے ہیں وہ مجھے عطا فرما اور اس کے علاوہ ایسا علم بھی عنایت کر جس کو میں کبھی فراموش نہ کروں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر بھی آمین کہی۔ اب ہم دونوں نے عرض کیا "یا رسول اللہ! ہم کو بھی ایسا علم عطا کیا جائے جو فراموش نہ ہو۔ ارشاد حق بنیاد ہوا "وہ دوسی نوجوان (ابوہریرہ) کے حصہ میں آچکا[2]" ایک مرتبہ انھوں نے بارگاہ رسالتؐ میں ضعف حافظہ کی شکایت کی، آپ نے فرمایا "چادر پھیلاؤ" انھوں نے چادر پھیلا دی۔ آپ نے اس میں دونوں دست مبارک ڈال دیے۔ پھر فرمایا "اسے سینے سے لگالو" ابوہریرہؓ کہتے ہیں "اس کے بعد میں پھر کبھی نہیں بھولا[3]"

---

[1] صحیح البخاری باب الحرص علی الحدیث۔ [2] تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۲۶۶

[3] صحیح بخاری باب حفظ العلم۔

جلالتِ علم حضرت ابوہریرہؓ کے ذوق وشوق، محنت وجستجو، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس شفقت ودعا کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ علمِ حدیث کے سب سے بڑے حافظ بن گئے اس کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان کو علم کا ظرف فرمایا[1] حضرت عبداللہ بن عمرؓ جو خود بھی صحابہ میں بڑے پایہ کے محدث ہیں، بیان کرتے ہیں کہ ابوہریرہؓ ہم سب میں اعلم بالحدیث تھے[2]

حافظ ذہبیؒ جو تنقیدِ رواۃ میں مرتبۂ بلند رکھتے ہیں فرماتے ہیں "ابوہریرہؓ علم کا ظرف تھے اور صاحبِ فتویٰ ائمہ کی جماعت میں اونچا مقام رکھتے تھے[3]"

حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں "ابوہریرہ اپنے معاصر راویوں میں سب سے بڑے حافظ تھے اور تمام صحابہ میں کسی نے حدیث کا اتنا ذخیرہ فراہم نہیں کیا[4]"

امام شافعیؒ کی رائے تھی کہ ابوہریرہؓ معاصر حفاظ حدیث میں سب سے بڑے حافظِ حدیث تھے

روایات حضرت ابوہریرہؓ نے جو روایتیں بیان کی ہیں ان کی مجموعی تعداد ۵۳۷۴ ہے۔ ان میں ۳۲۵ متفق علیہ ہیں ۷۹ میں امام بخاری اور ۹۳ میں امام مسلم منفرد ہیں[5]

حضرت ابوہریرہؓ کی کثرتِ روایت پر بعض لوگوں نے شک وشبہ کا اظہار کیا ہے لیکن ہمیں غور کرنا چاہئے کہ کیا محض اس بنا پر کہ وہ روایات کثرت سے بیان کرتے تھے ہم ان پر کسی قسم کا شک کرسکتے ہیں؟ اس سلسلہ میں ہم کو چند باتیں نظرانداز نہ کرنی چاہئیں۔

(۱) کثرتِ روایت کا سبب کیا تھا؟

(۲) اجلۂ صحابہ ان پر اعتماد کرتے تھے یا نہیں؟

(۳) ان کا حافظہ کیسا تھا؟

(۴) احادیث لکھتے تھے یا نہیں؟

---

[1] بخاری کتاب العلم [2] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۱۰ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۸
[4] تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۲۶۶ [5] تہذیب الکمال ص ۴۶۲۔

(۵) نقلِ روایت میں ان کا عام انداز احتیاط پسندانہ تھا یا نہیں؟
(۶) جتنی کثیر روایتیں حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت و صحبت کی مدت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کی تعداد عقلاً و عادۃً مستبعد ہے یا نہیں؟

اب ہم ان میں سے ہر ایک کے متعلق بالترتیب گفتگو کرتے ہیں۔

کثرتِ روایت کے اسباب

حضرت ابوہریرہؓ کو اللہ تعالیٰ نے جس قدر ذوقِ علم شوقِ تحقیق و جستجو عطا فرمایا تھا۔ اسی قدر ان کو علم کی اشاعت و تبلیغ کا بھی بڑا شوق تھا، اور ان کی دلی آرزو تھی کہ اقوالِ نبوی کا جو گنجینۂ نایاب ان کے سینہ میں محفوظ ہے اس سے وہ دوسروں کو بھی فیضیاب کریں، ان کو اس کا نہ صرف ذاتی شوق تھا بلکہ قرآن مجید کی ایک آیت کے بحکم اشاعتِ علم کو وہ اپنا ایک مذہبی فریضہ جانتے تھے۔ لوگوں نے اسی زمانہ میں ان پر اعتراضات کئے تو انھوں نے خود فرمایا "اگر سورۂ بقرہ کی یہ آیت۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا	بے شبہ وہ لوگ جو ہماری نازل کی ہوئی کھلی ہوئی
مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ بَعْدِ	نشانیوں کو اس کے بعد کہ ہم نے ان کو کتاب
مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ	میں لوگوں کے لئے بیان کر دیا ہے۔ چھپاتے
أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ	ہیں ان پر اللہ لعنت بھیجتا ہے اور لعنت بھیجے
اللَّاعِنُونَ۔	والے بھی لعنت بھیجتے ہیں۔

نہ ہوتی تو میں کبھی کوئی حدیث نہ بیان کرتا۔[1]

ایک طرف اشاعتِ علم کا یہ جذبہ اور دوسری طرف ان کو مواقع ایسے میسر تھے جو کسی دوسرے کو نہیں تھے۔ وہ خود ہی بیان کرتے ہیں "لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ ابوہریرہ بہت حدیثیں بیان کرتا ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ میرے مہاجر بھائی بازاروں میں اپنے کاروبار میں لگے رہتے تھے۔ اور انصار صاحبِ جائداد تھے وہ اس کے انتظامات میں مصروف

---

[1] بخاری کتاب العلم۔

رہتے تھے۔ میں فارغ البال تھا، ہر وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہتا تھا جن اوقات میں وہ لوگ موجود نہیں ہوتے تھے، میں ان میں بھی حاضر رہتا تھا۔ اور دوسرے لوگ جن چیزوں کو فراموش کر دیتے تھے میں انہیں یاد رکھتا تھا۔[1]

ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ نے ان سے پوچھا "تم کیسی حدیثیں بیان کرتے ہو حالانکہ جو کچھ میں نے دیکھا (یعنی افعال نبوی) اور سنا (قول نبوی) وہی تم نے بھی سنا اور دیکھا" بولے۔ "اماں! آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تطییب خاطر کے لئے زیبائش وآرائش میں مصروف رہتی تھیں اور مجھ کو خدا کی قسم کوئی چیز سرکار دو عالم سے غافل نہیں کر سکتی تھی۔"[2]

اجلۂ صحابہ ان پر اعتماد کرتے تھے

حضرت ابوہریرہ کی اس خصوصیت کو دوسرے اجلۂ صحابہ بھی تسلیم کرتے تھے اور ان کے خصوص حالات کے باعث ان کی روایتوں پر اعتماد کرتے تھے

ابو عامر روایت کرتے ہیں "ایک مرتبہ میں حضرت طلحہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص آیا اور کہنے لگا "ابو محمد! ہم کو نہیں معلوم یہ یمنی (ابوہریرہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ جانتا ہے یا تم" حضرت طلحہ نے فرمایا "اس میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ حدیثیں سنی ہیں جو ہم نے نہیں سنیں اور انہیں وہ چیز معلوم ہے جسے ہم نہیں جانتے ہم لوگ مالدار تھے۔ ہمارے اپنے گھر تھے بال بچے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صبح شام آتے اور چلے جاتے تھے۔ ابوہریرہ مسکین تھے ان کے پاس نہ مال تھا اور نہ ان کے متعلقین تھے۔ ان کا ہاتھ سرور کونین کے ہاتھ میں تھا۔ جہاں سرکار جاتے تھے وہ بھی جاتے تھے۔ پھر مکرر فرمایا ہم اس میں شک نہیں کرتے کہ وہ ایسی چیزیں جانتے ہیں جو ہم نہیں جانتے۔ اور انھوں نے ایسی حدیثیں سنی ہیں جو ہم نے نہیں سنیں اور

ولم یتھمہ احد منا انہ تقول	ہم میں سے کسی نے ان کو اس کی تہمت نہیں لگائی
علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

[1] صحیح مسلم فضائل ابی ہریرہ و بخاری کتاب العلم [2] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۰۹۔

فالمدیقل ھذالحدیث صحیح — طرف کوئی قول ایسا منسوب کیا ہے جو آپ نے

الاسناد علی شرط الشیخین[1] — نہیں فرمایا۔

ایک مرتبہ حضرت ابوہریرہؓ نے ایک حدیث بیان کی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے وہاں سے گذرتے ہوئے اس کو سنا تو فرمایا "ابوہریرہؓ! دیکھو تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا روایت کررہے ہو، حضرت ابوہریرہؓ فوراً کھڑے ہوگئے اور سیدھے حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوکر دریافت کیا آپ نے بھی یہ حدیث سنی ہے؟" فرمایا "ہاں! میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی ہے، اس پر حضرت ابوہریرہ بولے "ہم کو رسول اللہؐ سے نہ تو ازدواجی تعلق غافل رکھ سکتا تھا اور نہ بازاروں میں لین دین کرنا۔ میں آنحضرتؐ سے صرف دو چیزیں طلب کرتا تھا۔ کوئی کلمہ جس کی آپ مجھ کو تعلیم دیں یا ایک لقمہ جو آپ مجھ کو کھلائیں۔ ابن عمرؓ بولے

کنت الزمنا لرسول اللہ — اے ابوہریرہ، آپ ہم سب سے زیادہ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم واعلمنا — صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے والے اور آپ

بحدیثہ[2] — کی احادیث کو جاننے والے تھے۔

ایک مرتبہ مروان کو حضرت ابوہریرہ کی کوئی بات ناگوار ہوئی، اس نے غضبناک ہوکر کہا لوگ کہتے ہیں "ابوہریرہ بہت حدیثیں بیان کرتے ہیں۔ حالانکہ آنحضرتؐ کی وفات کے کچھ ہی دنوں پہلے مدینہ میں آئے تھے" فرمایا میں جب مدینہ میں آیا تو حضرت خیبر میں تشریف رکھتے تھے، اس وقت میری عمر تیس سال سے کچھ اوپر تھی اور آپ کی وفات تک سایہ کی طرح آپ کے ساتھ رہا۔ آپ کے ساتھ ازواج مطہرات کے گھروں میں جاتا تھا آپ کی خدمت کرتا تھا۔ آپ کے ساتھ لڑائیوں میں شریک ہوتا تھا۔ آپ کے ہمراہ حج کرتا تھا۔ اس لئے میں دوسرے لوگوں سے زیادہ حدیثیں جانتا ہوں، خدا کی قسم وہ جماعت جو مجھ سے قبل آپ کی صحبت میں

[1] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۱۱ [2] ایضاً ج ۳ ص ۵۱۱۔

تھی وہ بھی میری حاضر باشی کی معترف تھی اور مجھ سے حدیثیں پوچھتی تھی۔ ان میں حضرت عثمانؓ عمرؓ طلحہؓ اور زبیرؓ خاص طور پر قابل ذکر ہیں[1]۔

حضرت ابوایوب انصاریؓ جن کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہنچکر قیام فرمایا تھا بڑے پایہ کے صحابی تھے لیکن اس کے باوصف وہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرتے تھے کسی نے ان سے اس کی وجہ دریافت کی تو فرمایا میں ابوہریرہ سے کوئی حدیث روایت کروں مجھکو یہ زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کروں۔ غالبًا اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابوایوبؓ کو اپنے حافظہ پر اتنا اعتماد نہیں تھا جتنا حضرت ابوہریرہؓ کے حافظہ پر تھا۔ وہ ڈرتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں براہِ راست کسی حدیث کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کروں اور اس میں کچھ کمی بیشی ہوجائے۔

قوتِ حافظہ | حضرت ابوہریرہؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ملازمت وقرب مسلسل کا جو شرف حاصل تھا اس پر ان کی قوتِ حافظہ نے سونے پر سہاگے کا کام کیا تھا۔ پہلے معلوم ہوچکا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حافظہ کی قوت کے لئے دعا کی تھی اس کا اثر یہ ہوا جیسا کہ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ جو حدیث سن لیتے تھے بھولتے نہیں تھے۔ لوگ مختلف طریقوں سے امتحان لیتے تھے اور بالآخر انھیں حضرت ابوہریرہؓ کی قوتِ حافظہ کا اعتراف کرنا پڑتا تھا۔

ایک مرتبہ مروان نے حضرت ابوہریرہؓ کو بلایا اور اپنے کاتب کو تخت کے نیچے بٹھا کر ان سے حدیثیں پوچھنی شروع کیں۔ ابوہریرہ بولتے جاتے تھے اور کاتب انھیں لکھتا جاتا تھا۔ (حضرت ابوہریرہ کو اس کی خبر بالکل نہیں تھی) ایک سال کے بعد مروان نے انھیں پھر طلب کیا اور اس نے وہی حدیثیں دریافت کیں۔ حضرت ابوہریرہؓ نے گذشتہ سال کی طرح

---

[1] اصابہ ج ۷ ص ۲۰۵ [2] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۱۲۔

اس مرتبہ بھی بے کم وکاست بغیر زیادتی اور کمی کے وہ سب حدیثیں نقل کردیں یہاں تک کہ ترتیب میں بھی کوئی فرق نہیں آیا[1]۔

حدیث کی کتابت | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک تو غالباً حضرت ابوہریرہؓ نے حدیث کی کتابت نہیں کی کیونکہ اول تو انھیں اس کی فرصت ہی نہیں ہوتی ہوگی اور پھر انھیں یہ امید تھی کہ جس کسی حدیث میں کچھ شک ہوگا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کرکے اس کو رفع کرلیں گے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حضور کی وفات کے بعد قوت حافظہ کے باوجود از راہ احتیاط انھوں نے حدیثیں قلمبند کرنی شروع کردی تھیں اور پھر وہ جب تک اپنی کتاب نہ دیکھ لیتے کسی روایت کی توثیق و تصدیق نہ کرتے تھے۔ چنانچہ فضل بن حسن اپنے والد حسن بن عمرو کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے حضرت ابوہریرہؓ کو ایک حدیث سنائی۔ انھوں نے اس سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ حسن بولے میں نے یہ حدیث آپ سے ہی سنی ہے۔ فرمایا اگر مجھ سے سنی ہے تو میرے پاس ضرور لکھی ہوگی۔ اس کے بعد ابوہریرہؓ حسن کو ساتھ لیکر گھر گئے اور ایک کتاب دکھائی جس میں تمام حدیثیں درج تھیں۔ اس میں وہ حدیث بھی تھی حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا، میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ اگر تم نے وہ حدیث مجھ سے سنی ہے تو ضرور میری کتاب میں ہوگی[2]۔

احتیاط | اس روایت سے ان کی احتیاط فی الروایت کا بھی علم ہوتا ہے کہ کسی حدیث پر یونہی حکم نہیں لگا دیتے تھے۔ بلکہ جب تک اس کی خوب تحقیق نہ کرلیتے نفیاً یا اثباتاً کچھ نہ فرماتے اس کے علاوہ ایک اور روایت ہے جس سے ان کی خشیت الٰہی اور حدیث رسول اللہ کے جذبۂ احترام کا پتہ چلتا ہے۔ ایک مرتبہ شُفیا اصبحی مدینہ آئے تو حضرت ابوہریرہ کو دیکھا کہ بیہوش پڑے ہوئے ہیں اور لوگ ان کے چاروں طرف جمع ہیں۔ یہ ان کے پاس جاکر بیٹھ گئے۔ جب ذرا ہوش آیا تو درخواست کی کہ آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی ایسی حدیث سنایئے

---

[1] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۱۰ [2] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۱۱۔

جس کو خود آپ نے سنا اور سمجھا ہو۔ ابوہریرہ بولے "ہاں ایسی حدیث سناؤں گا۔ یہ کہا اور چیخ مار کر بیہوش ہوگئے۔ تین مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ ہوش میں آتے اور یہ کہکر کہ ہاں ایسی ہی حدیث سناؤں گا۔ پھر بیہوش ہو جاتے تھے۔ چوتھی بار بیہوشی کا حملہ اتنا شدید ہوا کہ غش کھا کے منہ کے بل گر پڑے۔ شفیا اصبحی نے ان کو سنبھال لیا اور دیر تک لئے بیٹھے رہے۔ افاقہ ہوا تو ایک حدیث بیان کی۔[1]

حق گوئی خشیت ربانی کے غلبہ کا ہی نتیجہ تھا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں نہایت بے باک اور جری واقع ہوئے تھے۔ حضرت ابوہریرہ مدینہ میں قیام پذیر تھے یہاں کا گورنر مروان تھا۔ ایک مرتبہ ابوہریرہ اس کے گھر تشریف لے گئے تو تصویریں آویزاں دیکھیں۔ چپ نہ رہ سکے فرمایا "میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جو خدا کی مخلوق کی طرح مخلوق بناتا ہے۔ اگر اس کی قدرت میں ہے تو کوئی ذرہ غلہ یا جو پیدا کرکے دکھائے۔[2]

عام تبصرہ اس میں کچھ شک نہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ غزوۂ خیبر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست اقدس پر مشرف باسلام ہوئے۔ اس لحاظ سے ان کو صرف چار سال صحبت نبوی سے فیضیاب ہونے کا موقع ملا۔ حضرت ابوہریرہؓ سے جو حدیثیں منقول ہیں ان کی تعداد اس مدت کے پیش نظر بظاہر زیادہ معلوم ہوتی ہے لیکن اگر اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ ان چار سالوں کی مدت میں حضرت ابوہریرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک لمحہ کے لئے بھی جدا نہیں ہوئے۔ اور سفر و حضر میں، جلوت و خلوت میں، رزم میں اور بزم میں ہر جگہ اور ہر مقام پر وہ آنحضرتؐ کے ساتھ ساتھ رہے۔ اور اس شرف معیت کی وجہ سے وہ حضورؐ کے تمام اقوال و افعال دیکھتے اور سنتے تھے۔ پھر خود بھی سوال کرنے میں بڑے جری اور بیباک تھے۔ تو یہ باور کر لینا بہت آسان ہو جاتا ہے کہ دراصل ان سب چیزوں کے لحاظ سے

---

[1] ترمذی باب ما جاء فی الریاء والسمعۃ۔ [2] مسند امام احمد بن حنبل۔

حضرت ابوہریرہ کی مرویات کی تعداد مدتِ صحبت کے اعتبار سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ بحث تو "مرویاتِ ابوہریرہ" کی کمیت کے لحاظ سے تھی۔ اب حضرت ابوہریرہ کی قوتِ حافظہ، احتیاط فی الروایت، اجلہ صحابہ کا ان پر اعتماد و وثوق، خشیتِ ربانی، خوفِ قیامت، فقر و استغنا، اعلانِ حق میں جرأت و بے باکی، احادیث رسول اللہ کے ساتھ غایت درجہ عشق و محبت ان کا نہایت احترام، احادیث کی کتابت، ان سب چیزوں پر غور کیجئے تو مرویاتِ ابوہریرہ کی کیفیت کے متعلق بھی صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کس پایہ کی ہیں اور ہمارے لئے کس درجہ لایق اعتبار ہو سکتی ہیں۔

یہ بھی واضح رہے کہ جن محدثین نے حضرت ابوہریرہؓ کی بعض حدیثوں پر کلام کیا ہے وہ اس پر مبنی نہیں ہے کہ انھیں حضرت ابوہریرہؓ پر اعتماد نہیں بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ سے محدث تک جو سلسلۂ رواۃ ہے اس میں بعض لوگ ایسے ہیں جو غیر ثقہ یا متکلم فیہ ہیں ورنہ محدثین کا اتفاق ہے کہ الصحابۃ کلھم عدول یعنی صحابی سب عادل ہیں۔

وفات | حضرت معاویہؓ کے عہدِ خلافت میں ۵۷ھ میں وفات پائی۔ یہی وہ سال ہے جس میں حضرت عائشہؓ کا وصال ہوا ہے بعض روایتوں سے ۵۸ھ کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ (مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۰۸)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ

نام ونسب | عبداللہ نام ابوالعباس کنیت، والد ماجد کا نام عباسؓ اور والدہ ماجدہ کا اسم گرامی ام الفضل لبابہ تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی، اور ام المومنین حضرت میمونہؓ کے بھانجے تھے۔ ہجرت سے تین سال قبل مکہ میں پیدا ہوئے۔ حضرت عباسؓ ۸ھ میں فتح مکہ سے کچھ پہلے علانیہ حلقہ بگوش اسلام ہو کر مدینہ پہنچے تو حضرت عبداللہؓ بھی ساتھ تھے۔ اس وقت ان کی عمر گیارہ سال کی تھی۔ عمر کے اعتبار سے اگرچہ بچہ تھے لیکن حضرت عباسؓ کی تاکید کی وجہ سے خدمت نبوی میں اکثر حاضر رہتے تھے اور مجلس کے مذاکرات سنتے تھے۔

مستشرقین کو حضرت ابن عباسؓ پر بڑا اعتراض یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ان کی عمر صرف تیرہ یا چودہ برس کی تھی اور ظاہر ہے کہ یہ عمر بچپن کی ہے جبکہ انسان میں سنجیدگی معاملہ رسی اور حقیقت بینی کا فقدان ہوتا ہے اس لئے جو حدیثیں آپ سے مروی ہیں ان کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے؟

اس اعتراض کا جواب معلوم کرنے کے لئے ہم کو امور ذیل پر غور کرنا چاہئے۔

(۱) حضرت ابن عباسؓ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنا تعلق تھا۔

(۲) آپ کا علمی پایہ کیا تھا؟

(۳) صحابہ میں آپ کو کیا وقعت ومنزلت حاصل تھی؟

(۴) روایات میں ان کی احتیاط کا کیا عالم تھا؟

اب ہم ان میں سے ہر ایک کا جواب لکھتے ہیں۔

ابن عباسؓ پر رسول اللہؐ کی نظر شفقت و تربیت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ابن عباسؓ کے ساتھ اول تو قرابت و رشتہ داری کا تعلق تھا۔ پھر یوں بھی آپ ان کی ذہانت و فطانت، ہونہاری اور سلامت روی کے باعث ان سے محبت کرتے تھے۔ ابن عباس آئندہ چل کر کیا ہونے والے تھے۔ ارباب نظر اس کا اندازہ اسی ایک بات سے کر سکتے ہیں کہ ان کی پیدائش کے بعد حضرت عباسؓ انھیں خدمت نبوی میں لیکر حاضر ہوئے تو آپ نے اپنے لعاب دہن سے اس بچہ کے کام و دہن کی ضیافت کرکے اس کی دستار ارجمندی و بخت بلندی پر مہر تصدیق ثبت کر دی[1]۔

ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سینہ سے لگا کر دعا کی اللھم علمہ الحکمۃ اے اللہ تو انھیں حکمت سکھا دے۔ بعض روایتوں میں حکمت کے بجائے فقہ کا لفظ آتا ہے[2]۔

اوپر معلوم ہو چکا ہے ام المومنین حضرت میمونہؓ حضرت ابن عباسؓ کی خالہ تھیں۔ وہ ان کو نہایت عزیز رکھتی تھیں۔ اس بنا پر آپ اکثر حضرت میمونہ کے گھر میں رہتے۔ اور کبھی کبھی رات کو بھی یہیں سو جاتے تھے۔ اس تقریب سے انھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتگذاری کا شرف حاصل ہو جاتا تھا۔

ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شب میں نماز کے لئے بیدار ہوئے۔ ابن عباسؓ نے وضو کے لئے پانی لا کر رکھدیا۔ آپ نے پوچھا "پانی کون لایا تھا؟" حضرت میمونہؓ بولیں عبداللہ۔ سرور کائناتؐ نے خوش ہو کر دعائیں دیں "اللھم فقھہ فی الدین وعلمہ التاویل" اے خدا ان کو مذہب کی صحیح سمجھ عطا فرما۔ اور تاویل کا طریقہ سکھا[3]۔

حضرت میمونہؓ کے ہی گھر کا دوسرا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابن عباسؓ تہجد کی نماز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے کھڑے ہوئے۔ آپ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انھیں اپنے برابر کھڑا کر لیا۔ لیکن وہ حیران و ششدر ہو کر رہ گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز سے

---

[1] اسد الغابہ ج ۳ ص ۱۹۲ [2] ایضاً [3] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۳۴۔

فارغ ہو کر دریافت کیا۔ کیا حال ہے؟ بولے "یا رسول اللہ! کیا آپ کے برابر کھڑا ہونا کسی کے لئے مناسب ہے حالانکہ آپ رسولِ خدا ہیں" یہ سن کر سیدِ دو عالم بہت خوش ہوئے۔ اور اُن کے لئے علم و فہم کی زیادتی کی دعا فرمائی۔[1]

وفاتِ نبوی کے وقت ابنِ عباسؓ کی عمر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت حضرت ابنِ عباسؓ کی عمر کیا تھی؟ اس میں اختلاف ہے۔ سعید بن جبیر نے خود حضرت ابنِ عباسؓ سے جو روایت بیان کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عمر پندرہ سال کی تھی لیکن غالباً یہ زیادہ صحیح ہے کہ اس وقت آپ تیرہ برس کے تھے۔ اب غور کیجئے تیرہ سال کی عمر کا ایک تندرست بچہ اور بالخصوص عرب ایسے گرم ملک کی آب و ہوا میں رہنے والا اچھا خاصہ جوان اور ذی شعور و احساس ہو جاتا ہے اور ایک معمولی قسم کا دانا و بینا انسان بھی اس عمر کے بچہ کو اور اس کے عام اطوار و حرکات کو دیکھ کر باطمینانِ تام اس کی آئندہ زندگی کے متعلق پیش گوئی کر سکتا ہے۔ پس اس عمر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت ابنِ عباسؓ کے ساتھ غیر معمولی محبت و شفقت ظاہر کرنا۔ اور متعدد مواقع پر ان کے لئے دعائیں فرمانا اور حضرت ابنِ عباسؓ کو دوسروں کی بہ نسبت آپ سے قرب و اتصال کے مواقع کا میسر ہونا یہ سب اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت ابنِ عباسؓ امت کے بہت بڑے ذمہ دار عالم اور شریعت و مذہب کے رموز و اسرار کے امین ہونے والے ہیں۔

علمی کمال

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کے مطابق ہی ہوا کہ حضرت ابنِ عباسؓ علم و حکمت کے ایک بحرِ ناپیدا کنار ہو گئے۔ قرآن۔ تفسیر۔ فقہ۔ حدیث۔ لغت اور شاعری ان میں کوئی علم ایسا نہیں تھا جس میں ان کو مہارتِ تامہ حاصل نہ ہو۔

مستشرقین حضرت ابنِ عباسؓ کی کثرتِ روایت کو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ان کی کم عمری کو دیکھ کر ان کی روایتوں پر شک و شبہ کا اظہار کرنے

---

[1] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۳۴۔

سے لگتے ہیں. لیکن حضرت ابن عباسؓ نے جس قدسی ماحول میں تربیت پائی اور پھر خود انھوں نے جس ذوق وشوق اور محنت وکاوش سے علم وکمال کی تحصیل کی. اور اجلہ صحابہ کے حیات ہونے کی وجہ سے جوان کو اس کے بیش از بیش مواقع حاصل تھے ان سب چیزوں کو بالکل نظر انداز کر جاتے ہیں۔

علمی شوق | ذیل میں چند واقعات نقل کئے جاتے ہیں جن سے حضرت ابن عباسؓ کے شوق علم کا اندازہ ہوگا۔

حضرت ابن عباسؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک انصاری سے کہا کہ رسول اللہ وفات پاگئے. لیکن آپ کے اصحاب زندہ ہیں. چلو ان سے علم حاصل کریں. انصاری بولے ابن عباس! لوگ خود علم میں تمہارے محتاج ہیں. پھر تم دوسروں کے پاس کیوں جاتے ہو؟ حضرت ابن عباسؓ نے یہ سن کر انھیں چھوڑ دیا اور تنہا تحصیل علم کے لئے نکل پڑے. تحقیق وجستجو کی فراوانی کا یہ عالم تھا کہ جس کسی شخص کے پاس انھیں کوئی حدیث معلوم ہوتی محنت ومشقت برداشت کر کے وہاں پہنچتے اور اطلاع دیتے وہ شخص گھر سے نکل آتا اور کہتا ابن عم رسول! آپ نے کیسے تکلیف کی. حضرت ابن عباسؓ فرماتے "میں نے سنا ہے کہ آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث سنی ہے" وہ کہتا "ابن عم رسول! آپ نے کیوں تکلیف کی کسی اور کو بھیج دیا ہوتا. فرماتے نہیں یہ میرا کام تھا اس لئے مجھ کو ہی آنا چاہئے تھا. ابن عباسؓ فرماتے ہیں انصاری کا حال یہی رہا. جب لوگ میرے پاس اکٹھے ہونے لگے تو انصاری نے کہا یہ نوجوان مجھ سے زیادہ عقلمند تھا[1]۔

ابو رافع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے اس لئے ان کو اقوال و افعال نبوی سننے اور دیکھنے کا موقع زیادہ ملا تھا حضرت ابن عباسؓ ان کے پاس ایک کاتب کو لیکر آتے اور پوچھتے جاتے کہ بتاؤ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں فلاں دن

---

[1] مستدرک حاکم ج ۳ فضائل ابن عباس ومع شرح بخاری۔

کیا کیا۔ ابورافع بیان کرتے جاتے اور کاتب قلمبند کرتا جاتا۔[1]

صحابہ میں آپ کی قدر و منزلت حضرت ابن عباسؓ کی ذاتی محنت و کوشش، تلاش و جستجو، بہترین تربیت، عمدہ ماحول اور پھر سب سے زیادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مشفقانہ دعاؤں کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ صحابۂ کرام میں علم و فضل کے اعتبار سے نہایت نمایاں مقام کے مالک ہوگئے۔ اکثر اکابر صحابہ جو عمر اور مرتبہ میں ان سے کہیں زیادہ تھے انھیں بھی ان کے سامنے قصورِ علم کا اعتراف کرنا پڑتا تھا۔

ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے "کانتا رتقا ففتقنٰھما" کا مطلب دریافت کیا انھوں نے اس شخص کو حضرت ابن عباسؓ کے پاس بھیجدیا۔ اس نے پوچھا تو انھوں نے فرمایا۔

"آسمان کا رتق یہ تھا کہ پانی نہ برساتا تھا اور زمین کا رتق یہ تھا کہ اس سے نباتات نہ اگتی تھیں۔ پھر اللہ نے ان میں فتق پیدا کردیا۔ تو آسمان سے بارش ہونے لگی۔ اور زمین سے نباتات اُگنے لگے سائل نے واپس آکر حضرت ابن عمرؓ کو یہ جواب سنایا تو انھوں نے کہا۔

لقد اوتی ابن عباس علماً	ابن عباسؓ کو واقعی سچا علم دیا گیا ہے پہلے
صدقا لقد کنت اقول ما یعجبنی	مجھ کو تعجب ہوتا تھا کہ ابن عباس تفسیر
جرأۃ ابن عباس علی تفسیر	قرآن میں کیسی جرات کرتے ہیں۔ لیکن
القرآن فالآن قد علمت	اب مجھ کو معلوم ہوگیا کہ واقعی ان کو علم
انہ قد اوتی علماً[2]	دیا گیا ہے۔

عمرو بن حبشی کہتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ حضرت ابن عمرؓ سے کسی آیت کا مطلب پوچھا تو بولے، ابن عباسؓ کے پاس جاؤ۔ اب جتنے لوگ بھی باقی ہیں خدا نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو نازل کیا تھا ان سب لوگوں میں ابن عباس اس کے سب سے بڑے عالم ہیں۔[3]

---

[1] اصابہ ج ۴ ص ۹۲۔ [2] ایضاً۔ [3] ایضاً ص ۹۳

علم بالسنت کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ صحابۂ کرام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول یا فعل کے متعلق اختلاف ہوتا تو وہ حضرت ابن عباس کی ہی طرف رجوع کرتے تھے۔ ایک دفعہ صحابہ میں اختلاف اس مسئلہ میں ہوا کہ سرور کونین نے احرام کہاں سے باندھا تھا؟ سعید بن جبیرؓ نے ابن عباس سے کہا ابن العباس! مجھ کو حیرت ہے کہ صحابہ میں حضورؐ کے احرام باندھنے کی جگہ سے متعلق اتنا شدید اختلاف ہے۔" آپ نے فرمایا "اس مسئلہ میں میری معلومات سب سے زیادہ ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی حج کیا تھا۔ اس لئے اختلاف اور بھی زیادہ ہوگیا ہے۔ سبب یہ ہے کہ جب آپ نے مسجد ذوالحلیفہ میں دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد احرام باندھا اور لبیک کہنا شروع کیا تو جو لوگ اس وقت موجود تھے انھوں نے اسی کو یاد رکھا پھر جب اونٹنی روانہ ہوئی اور آپ نے پھر لبیک کہا تو جو لوگ اس وقت موجود تھے وہ یہ سمجھے کہ آپ نے یہیں سے ابتدا کی ہے۔ پھر جب آپ بلند مقام پر چڑھے اور لبیک کہنا شروع کیا تو جو لوگ اس وقت آکر ملے وہ سمجھے کہ آپ نے ابتدا یہیں سے کی ہے لیکن میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آپ نے مسجد میں احرام باندھا اس کے بعد جب اونٹنی روانہ ہوئی اس وقت۔ اور جب بلند مقام پر چڑھے۔ تب دونوں مرتبہ لبیک کہتے رہے۔[1]

یہ اور اس طرح کے دسیوں واقعات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام بڑے بڑے صحابہ حضرت ابن عباسؓ کی جلالت علم و کمال فضیلت کے معترف تھے اور عمر میں ان سے کم ہونے کے باوجود وہ ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ کسی نے ایک مرتبہ بھی ان پر عدم اعتماد کا اظہار نہیں کیا۔ اپنے مختلف فیہ مسائل میں انھیں کی طرف رجوع کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ ایسے مردم شناس متشدد فی الاسلام بزرگ حضرت ابن عباسؓ کی کم عمری کے باوجود ان کو شیوخ بدر کی مجلسوں میں برابر کا شریک رکھتے تھے کسی نے کہا ذرا تو

[1] ابوداؤد کتاب المناسک باب وقت الاحرام۔

ہمارے لڑکوں کے برابر ہیں" آپ نے فرمایا "تم ان کا مرتبہ جانتے ہو"[1]

روایت میں احتیاط | اس علم و فضل اور کمال و مہارت کے باوجود روایت کے معاملہ میں بے انتہا محتاط واقع ہوئے تھے۔ وہ حدیث بیان کرتے وقت اس کا بڑا خیال رکھتے تھے کہ کوئی غلط روایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہ ہوجائے۔ پہلے کسی مقام پر گذر چکا ہے کہ جب لوگوں نے رطب و یابس ہر قسم کی روایتیں بیان کرنی شروع کر دیں تو حضرت ابن عباسؓ نے روایت بیان کرنا ہی ترک کر دیا۔[2]

وہ لوگوں سے فرماتے تمہیں قال رسول اللہ کہتے وقت یہ خوف دامنگیر نہیں ہوتا کہ تم پر عذاب نازل ہوجائے یا زمین شق ہوجائے اور تم اس میں سما جاؤ۔[3]

مرویات کی تعداد | عموماً کہا جاتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کثیر الروایت تھے لیکن ان سے جو روایتیں مروی ہیں ان کی مجموعی تعداد ۱۶۶۰ بتائی جاتی ہے جن میں سے ۷۵ متفق علیہ ہیں یعنی ان کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ دونوں نے اپنی صحیحین میں نقل کیا ہے ان کے علاوہ ۱۱۰ روایتوں میں امام بخاریؒ منفرد ہیں اور ۴۹ میں امام مسلمؒ۔[4]

حضرت ابن عباسؓ نے ۶۸ھ میں بعمر ۷۱ سال اس جہانِ فانی کو الوداع کہا اب اگر آپ کی یہ عمر پیشِ نظر رکھی جائے اور پھر اس کے ساتھ ہی آپ کے شوق تحصیلِ علم، محنت و جستجو اور شب و روز کی مصروفیت و انہماک کو دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ مرویوں کی یہ تعداد کچھ زیادہ نہیں ہے اور دراصل یہ بھی حضرت ابن عباسؓ کی غایت احتیاط کا نتیجہ ہے۔

اس تفصیل سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں۔

---

[1] بخاری کتاب التفسیر باب قولہ فسبح بحمد ربک۔ [2] صحیح مسلم باب النہی عن الروایۃ عن الضعفاء۔
[3] مسند دارمی باب ما یتقی من تفسیر حدیث النبی صلعم۔ [4] تہذیب الکمال ص ۲۰۲

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابن عباسؓ پر ایک خاص نظرِ شفقت و تربیت رکھتے تھے۔

(۲) علم و فضل میں آپ کا مرتبہ نہایت اعلیٰ تھا۔

(۳) صحابہؓ میں آپ کو بڑی وقعت و منزلت حاصل تھی۔

(۴) روایت میں حضرت ابن عباسؓ صد درجہ محتاط واقع ہوئے تھے۔

ان سب حقیقتوں کے پیشِ نظر بتاؤ کہ کیا ایک لمحہ کے لئے بھی حضرت ابن عباسؓ پر شک و شبہ کا اظہار کیا جاسکتا ہے؟ یہاں سوال اس کا نہیں ہے کہ بعد والے لوگوں نے روایتوں میں کیا خلط ملط کر دیا جس کی وجہ سے تمام مرویاتِ ابن عباسؓ درجۂ قبول حاصل نہیں کر سکیں۔ یہاں تو صرف ثابت کرنا ہے کہ صحابہؓ میں جو بزرگ کثیر الروایت تھے اور جن کی کثرتِ روایت ہی مستشرقین کی نظر میں شک و شبہ کا باعث ہوتی ہے۔ وہ کس پایہ کے بزرگ تھے؟ اور کیا ان بزرگوں کی کثرتِ روایت کے باعث یہ کہا جاسکتا ہے کہ عہدِ صحابہؓ میں احادیث کا ذخیرہ اتنا مشتبہ ہوگیا تھا کہ بعض بڑے بڑے صحابہؓ بھی اس سے مبرا قرار نہیں دیئے جاسکتے؟

صحابہؓ سب عادل ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابن عباسؓ یہی دو جلیل القدر صحابی ہیں۔ جن پر ان کی کثرتِ روایت کی وجہ سے بعض گستاخوں نے زبانِ اعتراض کھولی ہے ان کے علاوہ جو صحابہ کرامؓ ہیں ان پر نہ کچھ ایسے زیادہ اعتراضات کئے گئے ہیں اور نہ فرداً فرداً ان میں سے ہر ایک پر گفتگو کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ ائمۂ اسلام نے جرح و تعدیل کے جو اصول مقرر کئے ہیں صحابۂ کرامؓ کی مقدس ذات ان سے بہت بلند و بالا ہے اور وہ سب کے سب عدول اور ثقہ ہیں۔

حافظ ابن حجرؒ نے اصابہ کے مقدمہ میں فصل ثالث کے ماتحت اس پر تفصیلی بحث کی ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس کا اقتباس درج کیا جائے۔ فرماتے ہیں:۔

"سب اہل سنت اس پر متفق ہیں کہ تمام صحابہؓ عادل ہیں، چند مبتدع لوگوں کو چھوڑ کر

کسی کا اس میں اختلاف نہیں ہے۔ خطیب نے کفایہ میں اس پر ایک نفیس فصل لکھی ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ صحابہؓ کی عدالت تو اس لئے ثابت ہے کہ خود خدا نے ان کی تعدیل کی ہے اور ان کی طہارت و پاکیزگی کی خبر دی ہے مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔ اور وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا اور لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ۔ وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ۔ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ۔ لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَيَنْصُرُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ أُولٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ۔ یہ اور ان کے علاوہ اور آیاتِ کثیرہ اور احادیثِ صحیحہ ہیں جن سے صحابہؓ کی عدالت و ثقاہت یقینی طور پر معلوم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس تعدیل کے بعد اب وہ انسانوں میں سے کسی کی تعدیل کے محتاج نہیں ہیں اور اگر اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے صحابہ کرامؓ کی تعدیل میں یہ آیات و احادیث نہ وارد ہوتیں تب بھی ان کی بے مثل خدماتِ اسلام یعنی ہجرت، جہاد، اسلام کے لئے جان و مال کی قربانی، آباء اور ابناء کا قتل، دین میں خیرخواہی و خیر اندیشی، قوتِ ایمان و یقین، ان کی عدالت و نزاہت کا اور اس بات کا یقین دلانے کے لئے کافی ہیں کہ وہ اپنے بعد میں آنیوالے لوگوں اور تمام تعدیل کرنے والوں سے افضل و اعلیٰ ہیں۔ تمام علماء کا مسلک یہی ہے۔

ابوزرعہ رازی کہتے ہیں جب تم کسی شخص کے متعلق سنو کہ وہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے کسی کی تنقیص کر رہا ہے تو سمجھ لو کہ وہ زندیق ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول حق ہے، قرآن حق ہے اور جو کچھ قرآن مجید لایا ہے وہ حق ہے اور یہ سب

کچھ ہم تک صحابۂ کرامؓ کی وساطت سے ہی تو پہنچا ہے اور یہ لوگ (صحابہ پر جرح کرنے والے) چاہتے ہیں کہ ہمارے گواہوں (صحابہ) پر جرح کریں تاکہ اس طریقہ سے کتاب وسنت کو ناقابلِ اعتبار قرار دیدیں۔ یہ لوگ خود اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ ان پر جرح کی جائے۔ یہ زنادقہ ہیں۔

صحابہؓ کی فضیلت میں احادیث بھی بہت کثرت سے آئی ہیں مثلاً ترمذی اور ابنِ حبان نے اپنی "صحیح" میں عبداللہ بن مغفل کی حدیث نقل کی ہے کہ "میرے اصحاب کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے اللہ سے ڈرو، ان کو اپنے طعن وتشنیع کا نشانہ نہ بناؤ، جو شخص ان سے محبت رکھتا ہے وہ مجھ سے محبت رکھنے کے باعث ان سے محبت کرتا ہے اور جو ان سے بغض رکھتا ہے وہ مجھ سے بغض رکھنے کی وجہ سے ان سے بغض رکھتا ہے جس نے ان کو تکلیف پہنچائی اس نے مجھ کو تکلیف پہنچائی اور جس نے مجھ کو تکلیف پہنچائی اس نے اللہ کو تکلیف پہنچائی اور قریب ہے کہ اللہ اس کو اپنی گرفت میں لے لے۔[1]

ابو محمد بن حزم فرماتے ہیں:۔

"سب صحابہؓ یقیناً اہلِ جنت ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَا یَسْتَوِیْ مِنْکُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ اُولٰٓئِکَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الْحُسْنٰی" اور ایک جگہ ارشاد ہے: "اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَہُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓی اُولٰٓئِکَ عَنْہَا مُبْعَدُوْنَ" پس یہ بات ثابت ہوگئی کہ تمام صحابہ اہلِ جنت ہیں اور ان میں سے کوئی نار میں داخل نہیں ہوگا کیونکہ ان آیتوں کا خطاب انھیں سے ہے۔

عبداللہ بن ہاشم الطوسی بروایت وکیع بیان کرتے ہیں کہ حضرت سفیان فرماتے تھے

[1] اصابہ فی تمییز الصحابہ مقدمہ ص ۱۰، مطبوعہ مصر۔

"قل الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفٰی" میں عبادہ الذین اصطفٰی

سے مراد صحابۂ کرام ہیں۔[1]

حافظ ابنِ حجرؒ نے اپنی تقریر میں ابوزرعہ رازی کے حوالے سے جو قول نقل کیا ہے عقلی اعتبار سے وہ عدالتِ صحابہؓ کی قوی ترین دلیل ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہر جماعت میں چند لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اس جماعت کی عملی تشکیل کرتے ہیں اس کے لئے قواعد و ضوابط وضع کرتے ہیں۔ اور اس کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے ہر بڑی سے بڑی قربانی کے پیش کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتے۔ جماعتی اصول کے مطابق یہ لوگ ہر قسم کی تنقید سے بلند و بالا ہوتے ہیں۔ اور ہونا بھی یہی چاہئے کیونکہ اگر ان پر بھی اصولِ جرح و تعدیل جاری کئے جائیں تو پھر وہ جماعت جماعت باقی نہیں رہ سکتی۔

یہ ظاہر ہے کہ ہم تک کتاب و سنت کا جو کچھ ذخیرہ پہنچا ہے حضرات صحابۂ کرامؓ کی وساطت سے ہی پہنچا ہے۔ اگر ان پر بھی اور لوگوں کی طرح جرح و تعدیل کی جائے گی تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ سنت کا کیا ذکر خود قرآن مجید بھی (معاذ اللہ) ناقابلِ اعتبار قرار پا جاتا ہے۔ کیونکہ قرآن مجید کے قابلِ اعتماد ہونے کی دلیل آپ کے پاس بجز اس کے کوئی نہیں ہے کہ وہ نقلِ متواتر کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے۔ نقل متواتر کی تعریف یہ ہے کہ ہر زمانہ میں اس روایت کو ایسی کثیر جماعت نے نقل کیا ہو کہ ان سب کا کذب پر متفق ہونا عادۃً محال ہو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ جماعت افراد سے مرکب ہوتی ہے اور چونکہ ہر ہر فرد میں کذب بیانی کا احتمال ہے اس لئے جماعت میں بھی اس بات کا احتمال ہو سکتا ہے کہ وہ سب کی سب کذب پر متفق ہو گئی ہو۔ اور سب سے پہلی جماعت جس نے قرآن مجید نقل کیا صحابہ کی ہی ہے۔ پس اگر صحابہ کی جماعت کو جرح و تعدیل سے بلند و بالا نہ تسلیم کیا جائے تو اس کا نتیجہ بجز اس کے کیا ہوگا کہ خود قرآن نقلِ متواتر کے باوجود معرض شک و شبہ ہو جائے اور ظاہر ہے اس کو منکرین

[1] بحوالہ مقدمہ اصابہ۔

حدیث بھی برداشت نہیں کرسکتے فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ ۔

چنانچہ حافظ ابن صلاح فرماتے ہیں۔

ثم ان الامۃ مجمعۃ علی تعدیل	پھر امت کا تمام صحابہ کی تعدیل پر اتفاق
جمیع الصحابۃ ومن لابس	ہے اور جو صحابہ فتنوں کے ساتھ دو چار ہوئے
الفتن منہم فکذالک	ہیں وہ بھی ان میں سے ہی ہیں۔ اور یہ
باجماع العلماء الذین یعتد	فیصلہ صحابہ کے ساتھ حسن ظن اور ان کے
بہم فی الاجماع احسانا للظن	فضائل و مکارم کو پیش نظر رکھنے کی وجہ
بہم ونظرا الی ما تمہد لہم	سے ہے۔ اور چونکہ یہ مقدس حضرات
من المآثر وکان اللہ سبحانہ	شریعت کے نقل کرنے والے ہیں اس لئے
وتعالی اتاح الاجماع علی	اللہ تعالیٰ نے گویا ان کی عدالت پر امت
ذالک لکونہم نقلۃ الشریعۃ۔[1]	کا اجماع مقرر کردیا۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں۔

"سلف امت اور جمہور خلف کا اس پر اتفاق ہے کہ صحابہ کی عدالت اس لئے ثابت ہے کہ خود اللہ نے ان کی تعدیل اور ان پر ثنا کی ہے۔ بس یہی ہمارا اعتقاد ہے۔"[2]

یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مواقع پر صحابہ کے کسی فعل پر نکتہ چینی کرنے اور ان میں سے کسی کی شان میں گستاخانہ کلمات کہنے کی سخت ممانعت فرمائی ہے۔ جمعہ کے خطبہ میں بارہا سنا ہوگا۔

اللہ اللہ فی اصحابی	تم میرے اصحاب کے متعلق کچھ کہتے ہوئے
لا تتخذوہم من بعدی	اللہ سے ڈرو، ان کو میرے بعد نشانہ
غرضا۔	نہ بناؤ۔

[1] مقدمہ ابن صلاح ص ۲۹۰ [2] المستصفی جز ۱ ص ۱۶۵

عدالت سے مراد لیکن یہاں اس امر کی تصریح کردینی ضروری ہے کہ صحابہ کی عدالت سے مراد کیا ہے؟ اصل یہ ہے کہ اصولِ حدیث کی اصطلاح میں عدالت کے معنی جھوٹ نہ بولنا ہیں۔ پس ہم صحابہ کو جو عادل کہتے ہیں تو اس سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ وہ بے گناہ اور معصوم ہیں بلکہ مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی کی طرف کذب کا انتساب نہیں کیا جاسکتا یعنی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کسی صحابی ؓ نے عمداً و قصداً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی ایسی بات منسوب کی ہے جو آپ نے نہیں فرمائی۔ اس کا دعویٰ کسی محدث نے نہیں کیا کہ صحابہؓ انبیاء کی طرح معصوم ہیں اور ان سے احتیاط و تقویٰ کے خلاف کوئی فعل صادر نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ علامہ ابن انباری ؒ کا قول ہے۔

لیس المراد بعدالتھم ثبوت	صحابہ کی عدالت سے یہ مراد نہیں ہے کہ صحابہ
العصمۃ لھم واستحالۃ المعصیۃ	بالکل معصوم ہیں اور ان سے معصیتوں کا صادر
منھم وانما المراد قبول روایاتھم	ہونا محال ہے بلکہ مراد صرف یہ ہے کہ اسباب
من غیر تکلف البحث عن اسباب	عدالت اور تزکیہ کی طلب سے متعلق بحث کے
العدالۃ وطلب التزکیۃ الا	بغیر ان کی روایتیں قبول کی جائیں گی مگر ہاں اس
ان یثبت ارتکاب قادح ولم	صورت میں جبکہ کسی امر قادح کے ارتکاب کا
یثبت ذالک [1]	ثبوت بہم پہنچ جائے اور یہ ثابت نہیں ہے۔

حضرت مولانا شاہ عبد العزیز صاحب ؒ لکھتے ہیں:۔

"اہل سنت کا یہ ثابت و مسلم عقیدہ ہے کہ صحابہؓ کل کے کل عادل ہیں۔ یہ لفظ بار بار بولا گیا ہے اور میرے والد مرحوم (شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ؒ) نے اس لفظ کی حقیقت سے بحث کی تو یہ ثابت ہوا کہ اس موقع پر عدالت کے متداول معنی مراد نہیں ہیں بلکہ صرف عدالت فی روایت الحدیث مراد ہے۔ اس کے سوا اور کچھ مراد نہیں ہے اور

---

[1] ارشاد الفحول للشوکانی ص ۷۰ بحوالہ اسوۂ صحابہ۔ دار المصنفین اعظم گڈھ

اس عدالت کی حقیقت روایات میں جھوٹ بولنے سے بچنا ہے کیونکہ ہم نے تمام صحابہؓ کی سیرت کو خوب ٹٹولا یہاں تک کہ ان لوگوں کی سیرت کا بھی مطالعہ کیا جو خانہ جنگیوں، فتنوں اور لڑائی جھگڑوں میں شریک ہوئے تو معلوم ہوا کہ وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت دروغ بیانی کو سخت ترین گناہ سمجھتے تھے اور اس سے شدت کے ساتھ احتراز کرتے تھے [1]

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے یہ خوب فرمایا کہ جو صحابہؓ خانہ جنگیوں میں مبتلا تھے ان کی سیرت کی اچھی طرح سے جانچ پڑتال کی گئی تو معلوم ہوا کہ روایت میں کذب بیانی سے کام انھوں نے بھی نہیں لیا اس کا اندازہ اس ایک بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ احادیث متواترہ کی تعداد محدثین کے نزدیک بہت ہی کم ہے اور ان ہی میں حدیث من کذب علی متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار بھی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صحابہ کرام میں اس حدیث کو قرآن کی طرح شہرت حاصل تھی اور وہ کذب فی روایت الحدیث سے کس درجہ خوف کھاتے تھے۔

عدالت کے معنی کی اس تنقیح کے بعد یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اگر ہم تمام صحابہ کو عادل مانتے ہیں یعنی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان میں سے کسی نے روایت میں کذب بیانی سے کام نہیں لیا تو اس میں کوئی بات "غیر صحیح اور قرآن کے خلاف نہیں ہے" اور نہ ہمارا یہ فیصلہ محض عقیدتمندی کا فیصلہ ہے۔

---

[1] ظفر الامانی ص ۱۳ بحوالہ اسوۂ صحابہ ص ۱۴۔

تابعین کا دور

صحابۂ کرام کے بعد تابعینِ عظام کا دور آیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابۂ کرام مختلف شہروں میں متفرق ہوگئے تھے اور اپنے اپنے مقام پر قرآن وحدیث کی تعلیم دیتے تھے۔ مکہ، مدینہ، شام، بصرہ، کوفہ، یمن اور مصر ان سب مقامات پر تعلیم قرآن و حدیث کی مستقل درسگاہیں قائم تھیں۔

مدینہ ان سب میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ اکابر صحابہ مثلاً حضرت عمرؓ، زید بن ثابت عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم یہیں تشریف فرما تھے، مکہ میں حضرت معاذ بن جبلؓ۔ کوفہ میں حضرت علیؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ۔ بصرہ میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور انس بن مالکؓ۔ شام میں حضرت معاذؓ، عبادہ بن الصامتؓ اور حضرت ابوالدرداءؓ مصر میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ علم وفضل کے جواہر لٹا رہے تھے۔ ان کی درسگاہِ فیض وارشاد سے بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے جن پر اسلامی علوم وفنون کو رہتی دنیا تک ناز رہے گا۔

یہی تابعین کرام ہیں جو صحابۂ کرام کے علم کے صحیح وارث ہوئے انھوں نے بکمال مشقت اور بغایتِ محنت وجستجو قرآن وحدیث کا علم حاصل کیا اور اس میں مہارت تامہ پیدا کرکے اس کو محفوظ ومضبوط بنیادوں پر قائم کردیا۔ تابعین کرام کے مختلف طبقات ہیں علامہ ابنِ سعد نے طبقات میں پہلے شہر کے لحاظ سے ان کی تقسیم کی ہے۔ پھر ایک شہر کے تابعین میں ثقاہت وعدالت کے لحاظ سے متعدد طبقات قائم کئے ہیں اور ہر طبقہ کے حالات بڑی محنت وجستجو اور تلاش وتحقیق سے جمع کئے ہیں۔

تابعینِ مدینہ کے طبقۂ اولیٰ میں سب سے زیادہ نمایاں اور مشہور شخصیت حضرت امام محمد بن مسلم معروف بہ ابن شہاب زہری کی ہے۔ صحابہ کے بعد علوم قرآن و حدیث کی نشر و اشاعت جن بزرگوں کی کوششوں کی رہین منت ہے امام زہریؒ کا نام ان کے سرفہرست ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی علمی کوششوں کا تذکرہ مختصراً کر دیا جائے

امام زہریؒ آپ کا نام محمد تھا اور ابوبکر کنیت۔ والد کا نام مسلم تھا۔ ان کے پردادا عبداللہ بن شہاب زعمائے قریش میں سے تھے۔ انہیں کی نسبت سے امام زہری ابن شہاب کہلاتے ہیں۔ ۵۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۴ھ میں وفات پائی۔ امام زہری میں تحصیلِ علم کی استعداد فطری تھی۔ ذہانت وذکاوت میں سب سے زیادہ نمایاں تھے۔ قوتِ حافظہ غیر معمولی رکھتے تھے[۱]۔ اسّی دن میں پورا کلام مجید حفظ کر لیا تھا۔ تمام عمر میں صرف ایک مرتبہ ایک حدیث میں کچھ شبہ ہوا تھا لیکن تحقیق سے معلوم ہوا کہ جس طرح انہیں یاد تھی وہ حدیث ویسی ہی تھی۔[۲]

اس غیر معمولی ذہانت وقوتِ حافظہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے علم کا ذوقِ جستجو بھی ایسا ہی مرحمت فرمایا تھا۔ اسی طلب میں آٹھ سال تک حضرت سعید بن المسیبؒ کی خدمت میں رہے۔ ابوالزناد کہتے ہیں "ہم علماء کے پاس زہری کے ساتھ جاتے تھے، ان کے پاس تختیاں اور صحیفے ہوتے تھے۔ جن میں وہ جو حدیث سنتے تھے لکھتے جاتے تھے۔ امام زہری کا ذوق کسی ایک علم وفن تک محدود نہ تھا بلکہ قرآن، حدیث، تاریخ، اور انسابِ عرب، ان میں سے وہ ہر ایک کا ذوق رکھتے تھے۔

ابو صالح لیث سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے زہریؒ سے زیادہ کسی کو جامع علوم و فنون نہیں دیکھا وہ ترغیب کی حدیثیں بیان کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ اس سے زیادہ کچھ اور نہ جانتے ہوں گے۔ پھر عرب اور انساب کے متعلق بیان کرنے لگتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سب سے بہتر وہ اسی کو جانتے ہیں پھر اگر قرآن و حدیث بیان کرنے پر آجاتے تو اس میں

---

[۱] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۴۰ [۲] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۴

بھی ایسی ہی عبارت دکھاتے تھے۔[1]

کتابتِ حدیث امام زہریؒ کا حافظہ اگرچہ نہایت قوی تھا لیکن از راہِ احتیاط وہ پھر بھی احادیث قلمبند کرتے تھے۔ صالح بن کیسان کا بیان ہے کہ میں تحصیلِ علم میں زہری کے ساتھ رہتا تھا انھوں نے مجھ سے کہا کہ سنن قلمبند کر لینی چاہئے۔ چنانچہ ہم نے تمام سنن لکھ لیں۔ سننِ رسول اللہ کو لکھ لینے کے بعد انھوں نے کہا کہ اب سننِ صحابہ لکھ لینی چاہئے لیکن ہم نے ان سنن کو نہیں لکھا اور زہری نے لکھ لیا۔[2]

بعض محدثین کے بیانات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے حکم سے سب سے پہلے امام زہریؒ نے احادیث کی تدوین کی تھی۔[3] یہ بیان صحیح ہو یا نہ ہو، یہ بہر حال یقینی ہے کہ امام زہریؒ نے احادیث کا ایک ضخیم مجموعہ تیار کیا تھا۔ امام شافعیؒ فرماتے تھے "اگر زہری نہ ہوتے تو مدینہ کے سنن ضائع ہو جاتے۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ فرماتے تھے اب سنتِ ماضیہ کا جاننے والا زہری سے زیادہ کوئی نہیں ہے۔[4] اسی قسم کا مقولہ حضرت مکحول سے بھی مروی ہے۔ ایوب السختیانی فرماتے تھے ما رأیت اعلم من الزھری۔[5]

حفظِ احادیث امام زہریؒ چونکہ کثرت سے روایت کرتے تھے اس لئے بعض لوگوں کو ان پر شبہ ہوتا تھا لیکن جب کبھی ان کا امتحان لیا گیا۔ تمام شکوک و شبہات کا پردہ خود بخود چاک ہو گیا۔

ایک مرتبہ ہشام بن عبد الملک نے اپنے کسی لڑکے کے واسطے ان سے حدیثیں قلمبند کرنے کی درخواست کی۔ آپ نے چار سو حدیثیں لکھدیں۔ ایک ماہ کے بعد ہشام نے امتحاناً کہا کہ وہ مجموعہ گم ہو گیا۔ امام زہریؒ نے وہی احادیث پھر لکھوا دیں۔ دونوں کو ملا کر دیکھا

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۴۔ [2] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۴۸۔ [3] مقدمہ فتح الملہم شرح مسلم ص ۹۲
[4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۳۔ [5] ایضاً۔

گیا تو ایک حرف کا بھی فرق نہیں تھا۔ [۱]

مرویات کی تعداد اور ان کا پایہ احادیث و سنن کا نہ معلوم کتنا ذخیرہ ان کے سینہ میں ہوگا۔ ان سے جو روایتیں مروی ہیں ان کی تعداد دو ہزار سے زیادہ ہے۔ پھر کیفیت و نوعیت کے اعتبار سے دیکھئے تو ان کا پایہ بہت ہی اعلیٰ ہے۔ عمرو بن دینار جو خود جلیل القدر محدث تھے فرماتے تھے "میں نے زہری سے زیادہ کسی کو حدیث میں قطعی فیصلہ کرنے والا نہیں دیکھا۔"[۲] امام احمد بن حنبلؒ اور اسحاق بن راہویہ فرماتے ہیں "زہری کی وہ روایات اصح الاسانید ہیں جو انہوں نے سالم سے اور سالم نے اپنے والد عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہیں۔"[۳]

شیوخ امام زہریؒ نے جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے۔ طلب علم میں ہر چشمۂ فضل و کمال سے سیراب ہونے کی کوشش کی تھی اس لئے ان کے شیوخ کا دائرہ بہت وسیع ہے جس میں چند فاضلہ خواتین بھی شامل ہیں۔ صحابہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن جعفرؓ، ربیعہ بن عبادؓ، مسور بن مخرمہؓ، انس بن مالکؓ، سہل بن سعدؓ، سائب بن یزیدؓ، شبیبؓ، ابو جمیلہؓ عبدالرحمٰن بن ازہرؓ، محمود بن ربیعؓ، عبداللہ بن ثعلبہؓ، عبداللہ بن عامرؓ، ابو امامہؓ، سعد بن سہل، اور ابو الطفیلؓ اور اکابر تابعین میں حضرت سعید بن المسیبؒ، شعبیؒ، حسن بصریؒ۔ اور مکحولؒ۔ امام زہریؒ جتنے بڑے محدث تھے فقیہ و مفتی بھی تھے چنانچہ ان کی وفات کے بعد محمد بن نوح نے ان کے فتاوی جمع کئے تو تین جلدوں میں آئے۔ [۴]

امام زہریؒ کے علاوہ اس عہد کے ائمہ حدیث جن کو سنن و آثار کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے حضرت نافع، اعمش اور قتادہ ہیں۔ امام زہریؒ کے تلامذہ پانچ طبقات پر منقسم ہیں۔ ان طبقات میں سے ہر طبقہ اپنے ماتحت طبقہ پر فضیلت رکھتا ہے۔ پہلے طبقہ میں وہ

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ ص ۱۰۲ و ۱۰۳۔ [۲] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۴۸۔ [۳] تہذیب الاسماء واللغات ج ا ص ۹۱
[۴] اعلام الموقعین ج ا ص ۲۹۔

حضرات داخل ہیں جو عدالت، ثقاہت، اتقان اور حفظ میں سب سے ممتاز ہیں اور اس کے ساتھ ہی اپنے شیخ کی طویل ملازمت و مصاحبت کا شرف رکھتے ہیں۔ دوسرے طبقہ میں وہ لوگ شامل ہیں جو عدالت اور ثقاہت میں طبقۂ اولیٰ کے برابر ہیں۔ لیکن انھیں شیخ کی مصاحبت ان لوگوں کے برابر نصیب نہیں ہوئی۔ تیسرے طبقہ میں وہ بزرگ داخل ہیں جنھوں نے شیخ کی ملازمت تو پہلے طبقے کے برابر کی ہے۔ لیکن وہ مفسدہ جرم سے پاک نہیں، طبقہ چہارم کا اطلاق اس جماعت پر ہوتا ہے۔ جس کے افراد طبقۂ ثالثہ کے ساتھ جرح و تعدیل میں شریک ہیں اور اس کے ساتھ ملازمتِ شیخ بھی کچھ زیادہ طویل نہیں رکھتے۔ پانچواں طبقہ ضعفاء اور مجہول رواۃ کا ہے

ان رواۃ میں مرتبہ اور درجہ کے لحاظ سے جو فرق ہے۔ اسی کے اعتبار سے ان کی روایتوں کے قبول و عدم قبول سے متعلق تشدد اختیار کیا گیا ہے۔ طبقۂ اولیٰ کے لوگ چونکہ سب سے اعلیٰ اور افضل ہیں اس لئے امام بخاریؒ صرف انہی کو مستند قرار دیتے ہیں اور ان ہی کی روایات پر اعتماد کرتے ہیں۔ کبھی کبھی طبقۂ ثانیہ کے رواۃ کی کوئی حدیث جس کی صحت کا ان کو یقین ہوتا ہے اسے بھی لے آتے ہیں۔ البتہ دوسرا طبقہ امام مسلمؒ کی شرط پر ہے۔ طبقہ ثالثہ کے رواۃ امام ابوداؤد اور نسائی کی شرط پر ہیں۔ طبقۂ رابعہ کے حضرات امام ابوعیسیٰ ترمذی کی شرط پر ہیں۔ پانچواں طبقہ مجہولین کا ہے اس لئے امام ابوداؤد کے نزدیک جو شخص ابواب کے ماتحت احادیث کی تخریج کرتا ہے اس کے لئے ان کی حدیث لینا جائز نہیں ہے۔ البتہ اگر اس کو دوسرے ذرائع سے اعتماد حاصل ہو جائے تو پھر اس روایت کے قبول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

امام زہری اور ان کے معاصر ائمۂ حدیث جن کے تراجم اور علمی کوششوں کے ذکر کا . . . یہاں موقع نہیں ہے۔ انھوں نے اقوال و افعالِ نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی حفاظت اور ان کی نشر و اشاعت میں صحابۂ کرامؓ کی صحیح جانشینی کا پورا پورا حق ادا کیا۔

پھر ان کے تلامذہ نے اپنے اساتذہ کے مسندِ درس و علم کو سنبھالا تو تاریخ گواہ ہے کہ انھوں نے بھی اس ورثۂ علمی کی حفاظت تنقیح و تحقیق اور اس کی اشاعت و توسیع میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور اس کو ہر امکانی کوشش کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ محفوظ و مامون کر دیا۔ یہ سلسلہ تدوین کے دور تک برابر جاری رہا۔

تیسری صدی ہجری میں جب "دورِ تدوین" کا آغاز ہوا تو اس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اب تک احادیث فقہ سے الگ نہیں تھیں اور اسی بنا پر لوگ سنت کے ساتھ اقوال صحابہ کو بھی ملائے رکھتے تھے۔ لیکن اب خیر القرون کے ختم ہونے کے بعد ضرورت محسوس ہوئی کہ حدیث کو بحیثیت ایک فن کے مدون کیا جائے۔ تو اقوالِ صحابہ کو سنت سے خارج قرار دیا گیا اور خود حدیث کی صحت معلوم کرنے کے لئے روایت کے قبول و عدم قبول کا معیار باقاعدہ طور پر مقرر کیا گیا۔ راویوں کا ایک ایک حال بڑی محنت و کوشش سے معلوم کیا۔ اسباب جرح و تعدیل کی تعیین ہوئی۔ حدیث کی متعدد قسمیں کی گئیں اور ان سب امور کی تکمیل کے لئے متعدد علوم و فنون مدون ہوئے جن کے حصار میں آج علم حدیث ہر قسم کے شکوک و شبہات سے دور نہایت مضبوط بنیادوں پر قائم ہے۔

اسناد صحابہ کرام کے عہد میں کسی روایت کی توثیق کا قاعدہ یہ تھا کہ راوی سے شہادت طلب کی جاتی تھی۔ تابعین کے عہد میں صرف شہادت کافی نہیں ہو سکتی تھی اس لئے اسناد کا سلسلہ قائم کیا گیا۔ یعنی جب کوئی راوی روایت بیان کرتا تھا تو اسے بتانا پڑتا تھا کہ اس نے وہ روایت کس سے سُنی ہے اور اس نے کس سے سنی تھی یہاں تک کہ وہ سلسلہ صحابی تک پہنچ جاتا تھا۔ بڑے بڑے ائمہ اس کا التزام کرتے تھے۔

ایک مرتبہ امام زہریؒ جن کی فراست و ثقاہت میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا انھوں نے حضرت سفیان بن عیینہؒ سے ایک حدیث بیان کی اور اس کے ساتھ اسناد بھی بیان کرنی شروع کی تو سفیان بولے "آپ سند رہنے دیجئے" امام زہریؒ نے فرمایا "کیا آپ بغیر سیڑھی کے

حجت پر پڑھنا چاہتے ہیں۔[1]

تاہم معلوم ہوتا ہے کہ تابعین کے دورِ اولین میں اسناد کا عام طور پر زیادہ اہتمام نہیں کیا جاتا تھا۔ لیکن جب طرح طرح کے فرقے پیدا ہو گئے اور بعض شریر النفس لوگوں نے اپنے عقائد باطلہ کو ثابت کرنے کے لئے احادیث وضع کرنی شروع کیں تو سند حدیث کی روایت کے لئے ایک لازمی اور اہم شرط قرار دیدی گئی۔ محمد بن سیرینؒ کا قول تھا۔

ان هذا العلم دین فانظروا — یہ علم دین ہے تم دیکھو کہ اپنے دین کو کس سے
عمن تاخذون دینکم — حاصل کر رہے ہو۔

پھر فرماتے ہیں۔

لم یکونوا یسئلون عن الاسناد — پہلے لوگوں سے اسناد کے متعلق سوال نہیں کیا جاتا
فلما وقعت الفتنة قالوا — تھا۔ پھر جب فتنہ واقع ہو گیا تو محدثین نے کہا
سموا لنا رجالکم فینظر الی — ہم سے اپنے راویوں کے نام بیان کرو تاکہ دیکھا
اهل السنة فیوخذ حدیثهم — جائے کہ وہ اہل سنت میں سے ہیں یا نہیں اگر ہیں تو ان
وینظر الی اهل البدع — کی حدیث قبول کر لی جائے اور اگر وہ اہل بدعت میں
فلا یوخذ حدیثهم[2] — سے ہیں تو ان کی حدیث ترک کر دی جائے۔

حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے تھے۔

"راویوں نے جھوٹ کی آمیزش شروع کر دی تو ہم نے تاریخ سے کام لینا شروع کر دیا۔"

حسان بن زید کہتے ہیں۔

"کذابین کی تاریخ سے بڑھکر ہمارا کوئی مددگار نہیں ہے۔ میں شیخ سے اس کا سن دریافت کرتا ہوں اس کی تاریخ پیدائش پوچھتا ہوں اگر وہ صحیح صحیح بتا دیتا ہے تو ہم اس کے صدق و کذب میں تمیز کر لیتے ہیں۔"

---

[1] تدریب الراوی [2] مقدمہ صحیح مسلم۔

حسن بن الربیع کہتے ہیں۔

"ایک بار میں بغداد گیا۔ جب واپس ہونے لگا تو اصحاب حدیث دو تکلسیری مشایعت کو آئے۔ میں باہر پہنچا تو انھوں نے کہا ذرا ٹھہر جایئے احمد بن حنبل آرہے ہیں۔ میں بیٹھ گیا۔ جب وہ آئے تو مجھ سے پوچھا کہ عبداللہ بن مبارک کا کس سنہ میں انتقال ہوا تھا؟ میں نے کہا سلسلہ میں۔ جب امام احمد بن حنبل سے دریافت کیا گیا کہ آپ کا اس سوال سے کیا مطلب تھا؟ تو فرمایا، میں کذابین کی شناخت اسی طرح کرتا ہوں۔"[1]

اسناد کی اہمیت | اسناد کو علم حدیث میں جو اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ عبداللہ بن مبارک فرماتے تھے "اسناد دین کا جزء ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو جس کے جی میں جو آتا کہہ گذرتا۔"[1]

علامہ ابن صلاح لکھتے ہیں "اصل اسناد اس امت کے خصائص میں سے ہے اور سنن موکدہ میں سے ایک بہت بڑی سنت ہے" ائمہ حدیث کو اسناد عالی کی طلب اتنی ہوتی تھی کہ نفس واپسیں کے وقت بھی جبکہ انسان دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوتا ہے اسے فراموش نہیں کرتے تھے۔ یحییٰ بن معین کا انتقال ہونے لگا تو کسی نے ان سے پوچھا۔ اس وقت آپ کی تمنا کیا ہے؟ فرمایا "ایک تنہا مکان اور ایک عالی اسناد" محمد بن اسلم الطوسی نے کہا ہے "اسناد کا قرب گویا کہ اللہ کا قرب ہے۔"[2] قرآن مجید میں جو ایک مقام پر "او اثارۃ من علم" آیا ہے حاکم وغیرہ نے مطر الوراق سے نقل کیا ہے کہ اس کا مصداق علم اسناد الحدیث ہے۔[3]

جس روایت کا سلسلہ ثقہ راویوں کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہنچتا تھا اُسے درجۂ قبول حاصل نہیں ہوتا تھا۔ ابو اسحاق ابراہیم بن عیسیٰ بیان کرتے ہیں۔

"ایک مرتبہ میں نے عبداللہ بن مبارک سے ایک حدیث "ان من البر بعد البر ان"

---

[1] ابن عساکر ص ۳۲ [1] مقدمہ ابن صلاح ص ۲۱۵ [2] ایضاً ص ۲۱۶ [3] التقلید والایضاح ص ۲۱۵

تصلی لابویك مع صلوٰتك وتصوم لهما مع صومك" کی نسبت دریافت کیا
تو انھوں نے پوچھا "تم نے یہ حدیث کس سے سنی ہے؟" میں نے کہا "شہاب بن
خراش سے" فرمایا "وہ تو ثقہ ہیں اور شہاب نے کس سے لی ہے؟" میں نے کہا "حجاج
بن دینار سے" فرمایا "وہ بھی ثقہ ہیں لیکن انھوں نے کس سے لی ہے؟" میں نے کہا
"وہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں" عبداللہ بن مبارک نے یہ
سن کر کہا "اے ابواسحاق حجاج بن دینار اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان
تو بڑے بڑے جنگل ہیں جن میں اونٹنیوں کی گردنیں ٹوٹ جاتی ہیں"۔ [1]

اسماء الرجال کی تدوین اس علم اسناد الحدیث کی وجہ سے ہی رواۃ حدیث کے حالات و سوانح
کی چھان بین کی گئی، ان کے اخلاق و اعمال کے ایک ایک گوشہ کی بکمال احتیاط و دیدہ وری
تحقیق و تفتیش کی گئی جس سے "اسماء الرجال" کا وہ عظیم الشان فن مدون ہوگیا جس کی نظیر کسی
قوم کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ جرمنی کے مشہور فاضل مستشرق ڈاکٹر اسپرنگر جنھوں نے حافظ
ابن حجر کی کتاب کی تصحیح کی ہے اصابہ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

"نہ کوئی قوم دنیا میں ایسی گذری نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال سا
عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے"۔ [2]

محدثین نے اس کٹھن راہ میں جس انتہائی جفاکشی، دیانت داری اور صلاح و تقوی کا
ثبوت دیا ہے، بے شبہ اس کو اسلام کا ایک معجزہ کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے جرح و تعدیل کا
جو معیار مقرر کیا تھا اس پر بادشاہوں سے لیکر بڑے سے بڑے ائمہ مذہب کو پرکھا۔ اور اس راہ
میں نہ ان کو کوئی دنیوی طاقت و حشمت مرعوب کر سکی اور نہ وہ کسی کی مذہبی قیادت و پیشوائی
سے خوفزدہ ہوئے۔ جس شخص میں کوئی ذرا سا نقص بھی دیکھا اس کو برملا اور علی الاعلان کہا کہ

---

[1] مقدمہ صحیح مسلم باب الکشف عن معایب رواۃ الحدیث۔
[2] بحوالہ سیرت النبی ج ا ص ۳۵۔ یہ حوالہ پہلے بھی ایک جگہ گذر چکا ہے۔

لوگ اس کی روایتیں قبول کرنے میں احتیاط برتیں۔ علی بن شقیق کہتے ہیں میں نے ایک مرتبہ عبداللہ بن مبارک کو دیکھا کہ ایک بھرے مجمع میں کہہ رہے تھے۔

"لوگو! عمرو بن ثابت کی حدیثیں مت قبول کرو، یہ سلف کی شان میں گستاخیاں کرتا ہے[1]"

یحییٰ بن سعید کہتے ہیں۔

"میں نے حضرت سفیان ثوری، شعبہ، مالک اور ابن عیینہ سے پوچھا کہ اگر ایک شخص حدیث میں لائق اعتماد نہ ہو اور مجھ سے کوئی شخص اس کے متعلق دریافت کرے تو میں کیا کہوں؟ سب نے بالاتفاق کہا، تم صاف صاف کہہ دو کہ وہ لائق اعتبار نہیں[2]"

امام مسلمؒ نے اپنی صحیح کے مقدمہ میں ایک فصل کے ماتحت اس پر مفصل کلام کیا ہے اور علماء و محدثین کے اقوال سے ثابت کر دیا ہے کہ اگر کسی شخص کے متعلق کوئی ذرا سا شبہ بھی ہو تو اس کی حدیث قبول نہ کرنی چاہیے اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کا اعلان عام کر کے لوگوں کو اس کے فتنہ و شر سے بچانے کی کوشش بھی کرنی چاہیے۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ اس سلسلہ میں کسی کے تدین اور تشرع کو بھی تثبت فی روایۃ الحدیث کا معیار قرار نہیں دیا گیا۔ امام یحییٰ بن سعید القطان جو فن جرح و تعدیل کے بے نظیر امام ہیں ان کا قول پہلے گذر چکا ہے۔

لم نر الصالحین فی شئ اکذب | صالحین کسی چیز میں اتنا جھوٹ نہیں بولتے
منھم فی الحدیث[3] | جتنا کہ وہ حدیث میں بولتے ہیں۔

امام مسلم اس کی توجیہ یہ کرتے ہیں کہ یہ لوگ عمداً جھوٹ نہیں بولتے بلکہ ان کی زبان سے خلاف واقعہ الفاظ نکل جاتے ہیں۔

معن بن عیسیٰ بیان کرتے ہیں کہ امام مالکؒ فرماتے تھے چار شخصوں کی حدیث بالکل نہ قبول کی جائے، ایک بے وقوف کی، دوسرے اس شخص کی جو اپنی خواہشات کا بندہ ہو اور

---

[1] مقدمہ صحیح مسلم [2] و [3] ایضاً

لوگوں کو ان کی دعوت دیتا ہو تیسرے اس شخص کی جو جھوٹا ہو اور اگرچہ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کذب بیانی کا ثبوت نہ پہنچا ہو، لیکن لوگوں کی بات چیت میں جھوٹ سے احتراز نہ کرتا ہو۔ اور چوتھے اس صاحب فضل و عبادت اور صاحب صلاح و تقویٰ کی حدیث بھی قبول نہ کی جائے جو اس حدیث کو جانتا ہی نہ ہو جسے وہ بیان کرتا ہے [۱]۔

محدثین کو کسی کے متعلق اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ یہ شخص روایت کے قبول کرنے میں راوی کی جانچ پڑتال اور اس کے حالات کی تحقیق نہیں کرتا تو وہ اس کو بھی خواہ وہ اپنی ذات سے کیسا ہی راست گفتار ہو ناقابلِ اعتبار قرار دیتے تھے۔ عبداللہ بن مبارک نے ایک راوی بقیہ کی نسبت فرمایا۔

صدوق اللسان ولکنہ یاخذ — زبان کا سچا ہے۔ لیکن وہ ہر کہ ومہ کی

عمن اقبل وادبر [۲] — روایت قبول کرتا ہے۔

اسماء الرجال کی کتابیں محدثین نے اس فن کو اس درجہ ترقی دی کہ رُواۃ کے احوال میں بڑی بڑی ضخیم کتابیں تصنیف کیں۔ پھر جو راوی ضعیف یا مجہول تھے ان کے احوال میں الگ، اور جو معتبر و ثقہ تھے ان کے حالات میں الگ کتابیں لکھیں۔

مولانا شبلیؒ لکھتے ہیں:۔

• سب سے پہلے اس فن یعنی راویوں کی جرح و تعدیل میں یحییٰ بن سعید القطان نے ایک کتاب لکھی وہ اس مرتبہ کے شخص تھے کہ امام احمد بن حنبل نے ان کی نسبت لکھا ہے کہ میری آنکھوں نے ان کا نظیر نہیں دیکھا۔ ان کے بعد اس فن کو زیادہ رواج ہوا اور کثرت سے کتابیں لکھی گئیں جن میں سے چند ممتاز تصنیفات حسب ذیل ہیں [۳]۔

---

[۱] توجیہ النظر ص ۳۹ [۲] ایضاً۔ [۳] مقدمہ سیرت النبی ص ۳۹

کیفیت	نام مصنف
خاص ضعیف الروایت لوگوں کے حال میں ہے	رجال عقیلی [1]
اس کتاب کا نام کتاب الجرح والتعدیل ہے۔	رجال احمد بن عبد العجلی متوفی ۲۶۱ھ
بہت ضخیم کتاب ہے۔	رجال امام عبد الرحمٰن بن حاتم الرازی المتوفی ۳۲۷ھ [2]
مشہور محدث ہیں یہ کتاب خاص ضعیف الروایت اشخاص کے حال میں ہے۔	رجال امام دار قطنی
اس فن کی سب سے مشہور کتاب ہے اور تمام محدثین متاخرین نے اس کو اپنا ماخذ بنایا ہے۔	کامل ابن عدی [3]

مولانا شبلی لکھتے ہیں یہ کتابیں آج نہیں ملتیں لیکن بعد کی تصنیفات جو ان ہی سے ماخوذ ہیں وہ دستیاب ہوتی ہیں ان میں زیادہ مشہور یہ ہیں۔
تہذیبؒ الکمال۔ تہذیبؒ التہذیب، لسانؒ المیزان۔ تقریبؒ۔ تاریخ کبیر بخاریؒ۔ تاریخ صغیر بخاریؒ (چھپ گئی) ثقات ابن حبانؒ (قلمی) تذکرۃ الحفاظ۔ مشتبہ النسبؒ (قلمی) انساب سمعانیؒ تہذیبؒ الاسماء واللغات۔ میزانؒ الاعتدال۔ کتابؒ الاسماء والکنیٰ "۔

ظاہر ہے کہ ایک روایت کے تمام راویوں کے متعلق ایک ایک جزئی کو معلوم کرنا سخت مشکل کام تھا لیکن بہ قول علامہ شبلی اس کام کے لئے سینکڑوں ہزاروں محدثین نے اپنی عمریں صرف کردیں، ایک ایک شہر میں گئے۔ راویوں سے ملے۔ ان کے متعلق ہر قسم کے معلومات بہم پہنچائے، جو لوگ ان کے زمانہ میں موجود نہ تھے ان کے دیکھنے والوں سے حالات دریافت کئے۔

[1] کتب خانہ آصفیہ میں اس کا نسخہ موجود ہے۔ [2] دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن سے شائع ہو گئی۔
[3] دار الکتب المصریہ میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے۔

راویوں کے مختلف حالات اور بعض دوسرے امور کی وجہ سے ہی احادیث کی متعدد قسمیں قرار دی گئیں اور ان کو صحیح و ضعیف وغیرہ پر تقسیم کیا گیا۔ ہم صرف حدیث صحیح کی تعریف بیان کریں گے اور باقی اقسام کا ذکر اسی ضمن میں آجائے گا۔

حدیث صحیح محدثین کے نزدیک صحیح حدیث وہ ہے۔ جس کی اسناد راوی سے لیکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل ہو یعنی درمیان میں سے منقطع یا مرسل نہ ہو، اور اس کو ایک ایسے شخص نے نقل کیا ہو جو عادل ہو، ضابط ہو، اور جس میں کسی قسم کا شذوذ یا علت نہ پائی جاتی ہو۔

عدالت عدالت کی تعریف میں اختلاف ہے۔ چنانچہ علامہ طاہر الجزائری فرماتے ہیں "تمام چیزوں میں سب سے زیادہ مشکل عدالت کو پہچاننا ہے" امام غزالیؒ مستصفیٰ میں فرماتے ہیں۔

"عدالت ایک ایسا ملکہ ہے جس کے ذریعہ انسان کبائر کے ارتکاب اور صغائر پر اصرار سے اجتناب کرتا ہے" بعضوں نے یہ بھی کہا ہے کہ عدالت کبائر اور صغائر دونوں سے باز رکھتی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ "جس شخص میں مروت اور طاعت غالب ہو وہ عادل ہے" ان تعریفوں کی بنا پر ایک وہ شخص جو کوئی ایسی حرکت کرتا ہے جس سے اس کے دین کی رکاکت پر استدلال کیا جا سکتا ہو مثلاً بازار میں کھانا، بازار میں پیشاب کرنا، عام لوگوں کے ساتھ ہنسی اور فضول کرنا۔ اس کو پایۂ عدالت سے ساقط سمجھا جائے گا۔

حافظ ابن تیمیہؒ نے سب سے الگ ایک نئی بات کہی ہے وہ فرماتے ہیں۔

"عدالت ہر زمانہ اور مکان میں اور ہر قوم میں اس کے ہی اعتبار سے ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر قوم میں شاہد وہی ہوتا ہے جو اس کے اپنے معیار عدالت کے مطابق ہو اسی اعتبار سے لوگوں میں حکم کرنا ممکن ہے ورنہ اگر ہر طائفہ میں شاہدوں کے لئے اداء واجبات اور ترک محرمات کی قید لگا دی جائے تو تمام یا اکثر شہادتیں باطل ہو جائیں"[1]

---

[1] توجیہ النظر ص ۲۹۔

حق یہ ہے کہ امام ہمام نے بہت ہی حکیمانہ اور فیصلہ کن بات کہی ہے۔ آپ کا مقصد یہ ہے کہ عدالت عدالت میں فرق ہوتا ہے. ظاہر ہے کسی مقدمہ میں گواہی دینے کے لئے جس عدالت کی ضرورت ہے اس کا معیار اتنا سخت نہیں ہو سکتا جتنا کہ اس عدالت کا جو روایتِ حدیث کے قبول کے لئے ضروری ہے. اب اگر عدالت کے تمام مختلف معیاروں کو سامنے رکھکر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سب سے زیادہ سخت معیار اس عدالت کا ہے جو راوی حدیث کے لئے ضروری ہے

اسماعیل بن ابی اویس کہتے ہیں:-

"میں نے ایک مرتبہ اپنے ماموں امام مالکؒ سے سنا فرمارہے تھے، میں نے ستر ایسے آدمیوں سے ملاقات کی ہے جنھوں نے قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ علیہ وسلم کہہ کر (مسجد نبوی کے) ان ستونوں کے پاس حدیث بیان کی لیکن میں نے ان کی کوئی حدیث قبول نہیں کی۔ حالانکہ ان میں سے ایک ایک شخص اتنا بڑا امین تھا کہ اگر اس کو بیت المال کا انچارج بنا دیا جاتا تو وہ اس کے حق میں امین ہی ثابت ہوتا۔"[1]

اس ایک واقعہ کی طرح کتب اسماء الرجال میں سینکڑوں واقعات مل سکتے ہیں جن سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ محدثین کے نزدیک عدالت کا جو معیار ہے وہ کس قدر سخت اور اونچا ہے۔
یہاں یہ معلوم کرنا بھی خالی از فائدہ نہ ہوگا کہ محدثین نے راوی کے لئے عدالت کی جو شرط لگائی ہے وہ خود قرآن سے مستنبط ہے ارشادِ گرامی ہے۔

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنْ جَاءَکُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْا الآیۃ	اے ایمان والو اگر تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی خبر لیکر آئے تو اس کی خوب تحقیق کرو۔

ایک موقع پر ہے۔

وَاَشْھِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْکُمْ۔	اپنے میں سے دو صاحبِ عدل انسانوں کی شہادت پیش کرو

[1] توجیہ النظر ص ۳۱۔

عدالت کے اعتبار سے طبقاتِ رواۃ علامہ جزائری فرماتے ہیں صحیح یہ ہے کہ ضبط و حفظ کی طرح عدالت بھی زیادتی اور نقصان قوت اور ضعف کو قبول کرتی ہے۔ اسی بنا پر علامہ نجم الدین سلیمان الطوفی نے شرح الاربعین میں بیان کیا ہے کہ روایت کا دارومدار راوی کے عدل و ضبط پر ہے۔ پس جو حضرات ان دونوں وصفوں میں مرتبۂ اعلیٰ پر ہوں گے جیسے حضرت شعبہ، سفیان اور یحییٰ بن سعید القطان وغیرہ ان کی حدیث صحیح ہوگی۔ اور اگر راوی عادل و ضابط تو ہے لیکن مرتبۂ اعلیٰ پر نہیں اس کی روایت حسن ہوگی۔ عدالت اور ضبط کے تفاوت کے اعتبار سے رواۃ کو نو طبقات پر تقسیم کیا گیا ہے[1] جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

ضبط صحت حدیث کے لئے دوسری شرط ضبط ہے۔ علامہ سخاوی فرماتے ہیں:۔

"ضبط کی دو قسمیں ہیں، ایک ضبط صدر، دوسرے ضبط کتاب، ضبط صدر یہ ہے کہ راوی نے جو کچھ سنا ہے وہ سب اس کو اس طرح یاد ہو کہ جب چاہے اسے مستحضر کر سکے۔ اور ضبط کتاب یہ ہے کہ جو سنے اُسے فوراً لکھ لے تاکہ اس میں کسی قسم کے خلل کے پیدا ہونے کا امکان ہی باقی نہ رہے یہ ضبط کی اعلیٰ قسم ہے"[2]

امام ترمذی، علل میں کہتے ہیں۔

"جو شخص حدیث کے معاملہ میں متہم بالکذب ہو اور مغفل ہو اور خطا زیادہ کرتا ہو، اکثر ائمہ حدیث کے نزدیک ایسے شخص کے لئے یہ بات طے شدہ ہے کہ اس کی روایت پر دھیان نہ دیا جائے"[3]

شذوذ حدیث صحیح کی تعریف میں تیسری شرط شذوذ سے خالی ہونے کی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ راوی نے جو حدیث روایت کی ہے اس میں کوئی ایسا شخص اس کے مخالف نہ ہو جو اس سے زیادہ قابلِ ترجیح ہو اور اس شذوذ کا تحقق اس وقت ہوگا جبکہ دونوں روایتوں میں جمع کرنا مشکل ہو۔

---

[1] توجیہ النظر ص ۳۰ [2] مقدمۂ فتح الملہم ص ۱۵ [3] ایضاً

علت | رہ گئی علت تو اس سے مراد یہ ہے کہ کوئی امر ایسا نہ پایا جائے جو صحت حدیث میں قادح ہو، مثلاً ارسال خفی یعنی راوی کا اپنے معاصر سے لفظ عن سے روایت کرنا جس سے یہ شبہ ہو کہ راوی نے اس سے سماع کیا ہے۔ حالانکہ اسے اپنے معاصر مروی عنہ سے بالکل سماع حاصل نہ ہو یا تدلیس یعنی راوی روایت تو کرتا ہے اس شخص سے جس سے اس کو سماع حاصل ہے لیکن نقل وہ روایت کرتا ہے جو اس نے اس سے نہیں سُنی اور اس انداز سے بیان کرتا ہے کہ گویا اس نے اس روایت کو خود مروی عنہ سے سُنا ہے۔ علت کی دو قسمیں ہیں خفیہ اور ظاہرہ، خفیہ کی مثال اوپر گذر چکی ظاہرہ کی مثال فسق اور سوء حفظ وغیرہ ہے۔[1]

حَسَن | حدیث کی دوسری قسم حسن ہے، اس کی تعریف عموماً یہ کی جاتی ہے کہ اس کا مخرج معلوم ہو اور رجال مشہور ہوں، مخرج معلوم ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ حدیث ایسے راوی سے مروی ہو جو اپنے شہر کے لوگوں سے روایت کرنے میں شہرت رکھتا ہو، مثلاً قتادہ اہلِ بصرہ سے روایت کرنے میں مشہور ہیں۔ پس اگر اہلِ بصرہ کی کوئی حدیث قتادہ سے مروی ہوگی تو کہا جائے گا کہ اس حدیث کا مخرج معلوم ہے۔ اس حدیث کے رواۃ باعتبار ثقاہت صحیح کے رواۃ کے برابر نہیں ہوتے۔ چنانچہ علامہ ابن جوزی اس کی تعریف میں فرماتے ہیں اس حدیث میں کچھ ضعف ہوتا ہے جو احتمال کا حامل ہوتا ہے۔ لیکن اس پر کسی عمل کی بنیاد رکھنا درست ہے: صحیح اور حسن یہ دونوں حدیث مقبول کی قسمیں ہیں۔

اس کے بالمقابل مردود کی تین قسمیں ہیں موضوع، متروک، منکر، اور ضعیف کی جس میں اسناد کے نقص کی وجہ سے ضعف ہوتا ہے چار قسمیں ہیں۔ منقطع، معضل، معلق، مرسل، پھر رواۃ کی تعداد کے اعتبار سے حدیث کی دو قسمیں ہیں متواتر اور خبر واحد، متواتر کی تعریف یہ ہے کہ اس کو ہر زمانہ میں اتنی کثیر جماعت نے نقل کیا ہو کہ ان سب کا جھوٹ بولنے پر متفق ہو جانا عادۃً محال ہو۔ جس حدیث میں تواتر کی شرطیں نہ پائی جائیں خبر واحد کہلاتی ہے اور اس کی متعدد قسمیں ہیں۔

---

[1] شرح مقدمۂ ابن صلاح ص ۸

اسناد اور رواۃ کی تعداد اور صفات کے لحاظ سے حدیث کی اتنی قسمیں کرنا دراصل اس بات کی دلیل ہے کہ محدثین نے حدیث کی صحت وسقم معلوم کرنے کے لئے اس کے ایک ایک جزء کا تجزیہ کیا، اسناد کے تمام رواۃ میں سے ایک ایک کو اچھی طرح جرح وتعدیل کی کسوٹی پر پرکھا اور الفاظ ومعانی کے لحاظ سے بھی اس کے تمام پہلوؤں پر عمیق بصیرت کے ساتھ غور وخوض کیا پھر ذرا ذرا سے فرق سے ایک حدیث کو دوسری حدیث سے ممتاز کرتے چلے گئے اور اس طرح حدیث کی بہت ساری قسمیں ہوگئیں۔ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ محدثین کا جو کارنامہ انتہائی مدح وستائش کا مستحق تھا اور یہ سب اس لئے ہی تھا کہ صحیح حدیث غیر صحیح حدیث سے بالکل ممتاز ہو جائے۔ وہی منکرین حدیث کی نظر میں معیوب ومذموم قرار دیا جاتا ہے۔ ایک صاحب لکھتے ہیں۔

انھوں (محدثین) نے احادیث پر جو احکام لگائے ہیں مثلاً قوی، صحیح، حسن، مقبول یا ضعیف، منکر، موضوع اور مردود، اس سے خود ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی یقینی فیصلے تک نہیں پہنچ سکتے۔ ورنہ روایت کی صرف دو ہی صورتیں ہیں۔ صحیح یا غلط؟

سبحان اللہ!

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد\
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

———×◆×———

امام بخاریؒ

یہاں تک ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ صحتِ حدیث کے عام معیار کی حیثیت سے تھا۔ اب ہم ان محدثین کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جنھوں نے اپنی کتاب میں اس کا التزام کیا ہے کہ وہ اعلیٰ معیار کے مطابق جو حدیث صحیح ہوگی اسی کو نقل کریں گے اس سلسلہ میں سب سے پہلا نام امام بخاریؒ کا ہے۔

نام و نسب آپ کا نام محمد تھا اور کنیت ابو عبداللہ نسب یہ ہے محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ بن بردزبہ۔ آپ کے اجداد فارس کے رہنے والے مجوسی تھے۔ سب سے پہلے جو شخص ان کے خاندان میں اسلام سے مشرف ہوئے مغیرہ ہیں۔ بخارا کے رہنے والے تھے۔ ۱۹۴ھ میں پیدا ہوئے۔ امام بخاریؒ کے والد ماجد اسماعیل بن ابراہیم بھی محدث تھے۔ امام ابھی کمسن ہی تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ آپ نے ماں کی آغوشِ کرم میں پرورش پائی۔

حفظِ حدیث دس برس کی عمر ہوئی تو امام بخاریؒ نے حدیث یاد کرنی شروع کی۔ آپ سے پہلے جو محدث تھے وہ اپنے اپنے شہروں کی احادیث جمع کرنے پر ہی اکتفا کرتے تھے۔ امام مالک بن انس نے حجاز اور خصوصاً اہلِ مدینہ کی احادیث جمع کیں۔ ابن جریج نے بھی اہلِ حجاز اور خصوصاً اہلِ مکہ کی ہی حدیثیں جمع کیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ امام بخاریؒ سے پہلے بھی ایسے محدثین تھے جو دور دراز کی مسافتیں طے کرکے گوشہ گوشہ سے حدیث جمع کرتے تھے لیکن امام بخاریؒ نے اس دائرہ کو اور زیادہ وسیع کر دیا تھا۔

طلبِ حدیث میں سفر چنانچہ آپ نے اپنے شہر کی احادیث سننے کے بعد بلخ کا سفر کیا اور وہاں کے محدثین سے حدیثوں کی سماعت کی۔ پھر مرو، نیشاپور، رے، بغداد، بصرہ، کوفہ، مکہ

مدینہ، مصر، دمشق، قیساریہ، عسقلان، حمص تشریف لے گئے اور ان جگہوں سے احادیث حاصل کیں۔

اس طویل سفر میں آپ نے سولہ برس صرف کئے اس مدت میں آپ نے جو کچھ محنت و مشقت برداشت کی ہوگی اس کا اندازہ کون لگا سکتا ہے؟

تنقیدِ حدیث امام بخاریؒ صرف حدیث سننے پر ہی اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ رُواۃ اور الفاظ و معانی کے اعتبار سے اس کی تنقید کرتے تھے۔ اور ایک ایک راوی کے حالات کی تحقیق کے لئے دور دراز ممالک کے کٹھن سفر اختیار کرتے تھے۔ یہ خدا کا بہت بڑا احسان ہے کہ امام بخاریؒ کی کوششیں بارآور ہوئیں۔ اور وہ احادیثِ صحیحہ کو احادیثِ غیر صحیحہ سے تمیز کرنے میں بخوبی کامیاب ہو گئے۔ امام ہمام کی یہ کامیابی دو وصفوں کی رہین منت ہے۔

آپ کا پہلا وصف غیر معمولی قوتِ حافظہ ہے وہ خود فرماتے ہیں۔

"مجھ کو ستر ہزار سے زیادہ حدیثیں یاد ہیں اور صحابہ و تابعین جن کی میں نے حدیث لی ہے ان میں کوئی ایسا نہیں ہے کہ مجھ کو ان کی تاریخ اور جائے پیدائش و وفات اور وطن معلوم نہ ہو اور میں جس کسی صحابی یا تابعی کی کوئی حدیث روایت کرتا ہوں میرے پاس اس کی اصل موجود ہوتی ہے۔"[1]

پھر اس غیر معمولی قوتِ حافظہ کے ساتھ امام بخاری احادیث لکھکر انھیں اور زیادہ محفوظ کر دیتے تھے اور صرف لکھنے پر ہی کفایت نہیں کرتے تھے بلکہ رات کے وسط میں بیدار ہو کر ان کا مطالعہ کرتے اور ان میں غور و خوض کرتے تھے۔

دوسری چیز جو امام بخاری کی مابہ الامتیاز ہے وہ ان کی غیر معمولی مہارت تنقید رجال ہے وہ خود فرماتے ہیں:۔

"تاریخ میں کوئی ایسا نام نہیں ہے، جس کے متعلق مجھ کو کوئی قصہ معلوم نہ ہو۔"

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۲ ص ۲۸۔

ایک مرتبہ ان کے سامنے ایک حدیث بیان کی گئی جس کے ایک راوی کا نام عطاء الکیخارانی تھا۔ کسی نے پوچھا کیخاران کس جگہ کا نام ہے؟ فرمایا "یہ یمن کے ایک گاؤں کا نام ہے حضرت معاویہؓ نے ان کو صحابہ کرام کی ایک جماعت کے ساتھ یمن بھیجا تھا۔ وہاں عطاء نے ان سے یہ دو حدیثیں سنی تھیں"[1]

امام بخاریؒ ان دو وصفوں میں سب سے ممتاز ہونے کے باعث اپنے عہد کے تمام بڑے محدثین سے اعلیٰ و افضل سمجھے جاتے تھے اور یہ حضرات بھی حدیث کے معاملہ میں امام کے فیصلہ کو ناطق قرار دیتے تھے۔ اسماعیل بن ابی اویس ایک محدث تھے۔ امام بخاریؒ نے ان کے مجموعۂ احادیث سے چند حدیثیں منتخب کرکے الگ کرلیں تو انھوں نے ان کو اپنے لئے الگ لکھ لیا اور پھر ازراہِ فخر کہا کرتے تھے "یہ وہ حدیثیں ہیں جو محمد بن اسماعیل نے میرے مجموعۂ احادیث سے منتخب کرلی ہیں"[2]

حجاز، کوفہ، بصرہ، بغداد، شام اور مصر و خراسان ان میں کوئی مقام ایسا نہیں تھا۔ جہاں کے علماء و فضلاء امام عالی مقام کی فضیلت و برتری کے سامنے سرِ تسلیم خم اور ان کی بارگاہِ علم و کمال میں عقیدت و ارادت کا خراج پیش نہ کرتے ہوں۔ ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء

تاریخ میں آپ نے التاریخ الکبیر، التاریخ الاوسط، اور التاریخ الصغیر کے نام سے جو کتابیں تصنیف کی ہیں۔ آپ کی مہارت و امامتِ فن کی شاہدِ عدل ہیں، ان کے علاوہ ضعیف راویوں کے حالات میں اور علل پر مستقل کتابیں کتاب الضعفاء اور کتاب العلل کے نام سے تصنیف کیں۔ کنیتوں پر آپ کی ایک مستقل کتاب کتاب الکنیٰ کے نام سے ہے ان کے ماسوا الادب المفرد، الجامع، الکبیر اور المسند الکبیر بھی آپ کی مشہور تصنیفات ہیں[3]۔ ان میں سے کتاب الضعفاء الصغیر اور التاریخ الصغیر، انوار احمدی پریس الٰہ آباد میں چھپ گئی ہیں۔ اور التاریخ الکبیر کا ایک حصہ حیدر آباد دکن سے شائع ہوا ہے۔

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۲ ص ۸ [2] ایضاً ج ۲ ص ۱۰ [3] مقدمہ فتح الباری ص ۴۹۲

الجامع الصحیح آپ کا سب سے بڑا کارنامہ جس کے احسان سے دنیائے اسلام کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی، آپ کی کتاب الجامع الصحیح ہے۔ امام بخاریؒ نے سولہ برس کی محنتِ شاقہ میں ملک ملک کی خاک چھان کر گوشہ گوشہ سے احادیثِ صحیحہ کے جوانمول جواہر ریزے فراہم کئے تھے۔ ان میں سے بھی بکمال تحقیق و تدقیق بالکل صحیح احادیث کا انتخاب اپنی صحیح میں جمع کر دیا جس کو بجا طور پر اصح کتاب بعد کتاب اللہ کہا جاتا ہے۔

بعض محدثین نے بخاری کی کسی کسی حدیث پر کلام کیا ہے لیکن مجموعی طور پر اس کو تمام کتبِ حدیث سے زیادہ صحیح اور مستند مانا گیا ہے۔ ابو جعفر کہتے ہیں امام بخاریؒ نے اپنی کتاب ابن مدینی، امام احمد بن حنبل، اور یحییٰ بن معین (جن کی جلالتِ شان اور ثقاہت و عدالت میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا) کے سامنے پیش کی تو سب نے متفق ہو کر اس کی صحت کی شہادت دی البتہ صرف چار حدیثیں ایسی تھیں جن کو محلِ نظر و تامل قرار دیا گیا۔ عقیلی کہتے ہیں ان چار حدیثوں میں بھی قول امام بخاری کا ہی صحیح ہے۔ حاکم ابو احمدؒ کہتے ہیں۔

محمد بن اسماعیل الامام فانہ	محمد بن اسماعیل الامام سب سے پہلے بزرگ ہیں
الذی الف الاصول دبین	جنہوں نے اصول ترتیب کئے اور ان کو لوگوں کے سامنے
للناس وکل من عمل بعدہ	بوضاحت بیان کیا۔ جس کسی شخص نے ان کے بعد
فانما اخذہ من کتابہ [2]	کوئی کام کیا ہے اس نے ان کی ہی کتاب سے لیا ہے۔

امام بخاری کی طرح امام مسلم کا مرتبہ بھی احادیثِ صحیحہ کے التزام و تنقید میں بہت بلند ہے لیکن مشہور محدث ابو الحسن الدارقطنی فرماتے ہیں اگر بخاری نہ ہوتے تو مسلم کے لئے ترتیب کتاب کی راہ ہموار نہ ہوتی، پھر فرماتے ہیں امام مسلمؒ نے بخاری کی کتاب کو ہی اپنے لئے اسوہ بنایا ہے اور اس میں اور احادیث کا اضافہ کر دیا ہے[3] تاہم حسنِ ترتیب اور طرقِ اسناد کی جامعیت کے لحاظ سے مسلم کا جو مقام ہے اس کی تفصیل امام مسلمؒ کے حالات میں آگے آئیگی۔

---

[1] مقدمہ فتح الباری ج ۲ ص ۲۰۳ ۔ [2] ایضاً [3] ایضاً

تعداد احادیث | حافظ ابن حجرؒ کے قول کے مطابق صحیح بخاری کی کل احادیث ۷۲۹۷، سات ہزار تین سو ستانوے ہیں۔ لیکن ان میں مکرر احادیث بھی شامل ہیں۔ البتہ معلقات، متابعات موقوفات اور مقطوعات داخل نہیں ہیں، اگر تعلیقات اور متابعات کو بھی شامل کر لیا جائے تو پھر یہ تعداد ۹۰۸۲ تک پہنچ جاتی ہے۔ مکررات کو الگ کرنے کے بعد اگر صرف احادیث متصلۃ السند کا شمار کیا جائے تو یہ تعداد گھٹ کر ۲۷۶۲ رہ جاتی ہے۔ خود امام بخاری کا ایک بیان ہے کہ مجھکو ایک لاکھ صحیح اور دو لاکھ غیر صحیح احادیث یاد ہیں[1] اس کے باوجود ان کا اپنی صحیح میں صرف دو ہزار سات سو باسٹھ احادیث کا جمع کرنا جس طرح ان کی غایت تحقیق و تنقید کی دلیل ہے اس بات کا بھی بیّن ثبوت ہے کہ یہ سب حدیثیں زرِ خالص ہیں اور ہم ان کو بے چون و چرا تسلیم کر سکتے ہیں۔

شروط بخاری | اور حقیقت بھی یہی ہے۔ امام بخاری نے حدیث لانے کی جو مخصوص شرطیں متعین کی ہیں ان کے پورا ہو جانے کے بعد پھر کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ امام علو مقام کی پہلی شرط جس میں ان کے ساتھ امام مسلم بھی شریک ہیں یہ ہے کہ حدیث کی اسناد متصل ہونی چاہئے یعنی امام بخاری نے اس کو جس راوی سے سنا ہے اس سے لیکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک اس کا سلسلہ برابر مربوط ہونا چاہئے۔ یہ نہ ہو کہ درمیان میں کہیں انقطاع پیدا ہو جائے۔ پھر اس روایت کے جتنے راوی ہیں ان سب کے لئے مسلمان صادق، غیر مدلس و غیر مختلط عدالت و ثقاہت کی تمام صفات کے ساتھ متصف، ضابط اور متحفظ، سلیم الذہن، قلیل الوہم اور صحیح الاعتقاد ہونا ضروری ہے۔ پھر جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، امام بخاریؒ حدیث کے ہر بڑے امام مثلاً امام زہری و نافع کے تلامذہ کو صحبت شیخ کی مدت و ملازمت اور حفظ و اتقان کے اعتبار سے چند طبقات پر تقسیم کرتے ہیں، یعنی ایک وہ جنھوں نے سفر و حضر میں شیخ کے ساتھ معیت و مصاحبت رکھی ہے اور پھر وہ حفظ و اتقان میں بھی سب سے

---

[1] تذکرۃ الحفاظ للذہبی تذکرۂ امام بخاری

نمایاں ہیں۔ دوسرے وہ جو حفظ و اتقان میں تو ایسے ہی مشہور ہیں لیکن ان کو شیخ کی صحبت زیادہ میسر نہ ہو سکی وقس علی ہذا۔ ان مختلف درجات کے محدثین میں سے امام بخاری رہ کی شرط یہ ہے کہ راوی درجۂ اول میں سے ہونا چاہیئے۔ درجۂ دوم کے راوی کی روایت بھی وہ لے لیتے ہیں لیکن اصل کے لحاظ سے نہیں بلکہ محض تعلیقاً۔

امام بخاری کی دوسری شرط یہ ہے کہ وہ روایت معنعن کو قبول نہیں کرتے یعنی اگر کوئی راوی اپنے کسی ہمعصر سے روایت کرتا ہے تو امام بخاری کے نزدیک محض ہمعصر ہونا کافی نہیں ہے بلکہ جب تک دونوں کی ملاقات ثابت نہیں ہوگی وہ حدیث قبول نہیں کی جائے گی۔ امام مسلم اس شرط کے خلاف ہیں۔ ان کے نزدیک معاصرت بھی قبولِ حدیث کے لئے کافی ہے۔ امام مسلم نے اپنی صحیح کے مقدمہ میں اس پر تفصیل سے بحث کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ روایت معنعنہ کے قبول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اور اکثر محدثین کا میلان خاطر بھی اسی طرف ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ محدثین کے نزدیک لفظ عن کا استعمال "قال" کی طرح مطلق اجازت اور اتصال کے لئے ہوتا رہا ہے اس لئے جب تک ارسال کا کوئی قوی قرینہ نہ ہو محض عن کی وجہ سے ارسالِ خفی کے شبہ پر روایت کو ترک کر دینا صحیح نہ ہوگا۔ تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ حقیقت خواہ کچھ بھی ہو، امام بخاری کا روایت عنعنہ کو قبول نہ کرنا ان کے کمالِ احتیاط و اتقان کی دلیل ہے چنانچہ ایک مرتبہ کسی شخص نے امام بخاری سے ایک حدیث کے متعلق سوال کیا جس میں تدلیس کا گمان ہوتا تھا۔ آپ نے فرمایا تم کو خیال ہوتا ہے کہ میں تدلیس کرتا ہوں حالانکہ میں نے اسی تدلیس کے شبہ پر ایک شخص کی دس ہزار بلکہ اس سے زائد حدیثیں ترک کر دی ہیں۔"

امام مسلمؒ | امام بخاری رہ کے بعد دوسرا مرتبہ امام مسلم کا ہے۔ آپ عربی الاصل تھے۔ قبیلۂ قشیر سے تعلق رکھتے تھے، نام مسلم تھا، کنیت ابوالحسین، نیشاپور آبائی وطن تھا، ۲۰۲ھ یا ۲۰۶ھ میں پیدا ہوئے۔ طلبِ حدیث میں عراق، حجاز، شام اور مصر کا سفر کیا۔ بغداد بھی

کئی مرتبہ تشریف لے گئے اور وہاں حدیث کا درس دیا۔ جس زمانہ میں امام بخاری رحمہ نیشاپور میں مقیم تھے امام مسلم نے ان سے بھی استفادہ کیا۔ ۲۶۱ھ میں بمقام نیشاپور وفات پائی۔

امام مسلم کی ہمہ گیر مہارت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے حدیث اور متعلقات حدیث پر کثرت سے کتابیں تصنیف کیں جن کے نام یہ ہیں

المسند الکبیر علی الرجال۔ کتاب الجامع علی الابواب۔ کتاب الاسماء والکنی۔ کتاب التمییز۔ کتاب العلل۔ کتاب الوحدان۔ کتاب الافراد کتاب الاقران۔ کتاب سوالاتہ احمد بن حنبل۔ کتاب حدیث عمرو بن شعیب کتاب مشائخ مالک۔ کتاب مشائخ الثوری۔ کتاب مشائخ شعبہ۔ کتاب من لیس لہ الا راو واحد۔ کتاب المخضرمین۔ کتاب اولاد الصحابۃ۔ کتاب اوھام المحدثین۔ کتاب الطبقات۔ کتاب افراد الشامیین۔ اور کتاب رواۃ الاعتبار۔[1]

لیکن ان کا سب سے بڑا علمی و دینی کارنامہ صحیح مسلم ہے جس میں انہوں نے غایت تحقیق و تدقیق کے ساتھ اپنی شروط کے مطابق منتخب احادیث صحیحہ جمع کردی ہیں بیان کیا جاتا ہے کہ مکرر احادیث سمیت کل احادیث کی تعداد ۷۲۷۵ اور مکررات کے علاوہ تقریباً چار ہزار حدیثیں ہیں۔

صحیح بخاری و صحیح مسلم کا موازنہ

امام مسلم کی جلالت شان اور بزرگی و برتری میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا لیکن بخاری اور صحیح مسلم میں موازنہ و مفاضلہ کے وقت جمہور کا فیصلہ یہ ہے کہ صحیح بخاری کو صحیح مسلم پر افضلیت ہے اور اس کے وجوہ یہ ہیں۔

[1] مقدمہ فتح الملہم۔ ص ۱۰۰

(۱) رجالِ مسلم میں سے جن لوگوں کو ضعیف کہا گیا ہے ان کی تعداد بہ نسبت ان رجالِ بخاری کے جن کی تضعیف کی گئی ہے زیادہ ہے۔ بخاری کے کل ایسے راوی ۸۰ ہیں اور مسلم کے ۱۶۰ جن سے صرف امام مسلمؒ نے روایت کی ہے۔

(۲) امام بخاریؒ ایسے ضعیف لوگوں کی روایتیں زیادہ نہیں لیتے صرف ایک دو حدیثیں لے لیتے ہیں۔ امام مسلمؒ نے ایسے لوگوں کی حدیثیں زیادہ تعداد میں لی ہیں۔

(۳) امام بخاری صرف درجۂ اول (جن کا ذکر اوپر آچکا ہے) کے رواۃ کی حدیثیں لیتے ہیں شاذ و نادر کہیں تعلیقاً درجۂ دوم کے رواۃ کی حدیثیں بھی نقل کر دیتے ہیں۔

(۴) امام بخاریؒ روایت معنعن پر اس وقت تک متصل بالسند روایت کا حکم نہیں لگاتے جب تک کہ معنعِن اور معنعَن عنہ کی ملاقات تاریخی اعتبار سے ثابت نہ ہو۔ اس کے برخلاف امام مسلمؒ روایتِ معنعن پر بھی اتصال کا حکم لگا دیتے ہیں۔ اگر راوی مدلس نہ ہو۔

یہ وجوہ ہیں جن کے باعث صحیح بخاری کو صحیح مسلم پر ترجیح دی گئی ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ بعض وجوہ سے صحیح مسلم کو صحیح بخاری پر فوقیت حاصل ہے ان میں ایک بڑی وجہ جیسا کہ حافظ ابن حجر اور بعض دوسرے علماء نے لکھی ہے یہ ہے کہ امام مسلم نے ایک حدیث کے جتنے طرق و اسانید انھیں معلوم تھے سب ایک جگہ جمع کر دیئے ہیں جس سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ طالب حدیث کو بیک وقت ایک حدیث کے تمام طرق معلوم ہو جاتے ہیں اور پھر اس کے لئے حدیث پر حکم لگانا سہل ہو جاتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگرچہ امام مسلمؒ نے بھی امام بخاریؒ کی طرح اپنی کتاب کو ابواب فقیہ پر مرتب کیا ہے لیکن انھوں نے خود کسی مسئلہ پر حکم لگانے سے اجتناب کیا اور اس باب کے ماتحت صرف احادیث کے جمع کر دینے پر کفایت کی ہے۔

انتقاد بخاری و مسلم | یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ بعض محدثین نے صحیح بخاری، اور

صحیح مسلم کی بعض حدیثوں پر جو کلام کیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ حدیثیں بالکل ساقط ہیں بلکہ وہ صرف ایک فنی کلام ہے۔ امام بخاریؒ و مسلمؒ نے اپنی تحقیق میں بعض راویوں کو عدول اور ثقہ سمجھا اور ان کی روایت قبول کرلی۔ اب بعض محدثین مثلاً دار قطنی اور ابن جوزی وغیرہ فرماتے ہیں کہ وہ لوگ متکلم فیہ ہیں تو ہم کو ان دونوں میں محاکمہ کرنا ہوگا اور چونکہ اکثریت امام بخاریؒ کی طرف ہے اور ان کی غایت تحقیق و تدقیق مسلم ہے اس لئے فیصلہ انھیں کے حق میں ہونا چاہیے۔

اور اگر تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیا جائے کہ یہ چند حدیثیں ضعیف ہیں تو ان کے علاوہ وہ تمام احادیث جن کی صحت پر امت کا اتفاق ہے انھیں تو تسلیم کرنا ضروری ہے تضعیفِ حدیث میں اگر ناقدین کا قول صحیح ہو سکتا ہے تو تصحیح کے باب میں بھی ان کا قول معتبر ہوگا۔ آخر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ آپ ان کے ایک قول کو تسلیم کریں اور دوسرے کو رد کردیں افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض۔

حافظ ابن حجرؒ بخاری و مسلم کے ناقدوں کی تنقید پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

• ہر مصنف کو یہ معلوم کرنا چاہیے کہ اگرچہ ان میں سے اکثر احادیث اصل موضوع کتاب میں کوئی قدح پیدا نہیں کرتیں کیونکہ جیسا کہ امام ابو عمرو بن الصلاح وغیرہ نے دعویٰ کیا ہے کہ اس کتاب کی تمام احادیث باجماع صحیح ہیں۔ تاہم زیادہ سے زیادہ یہی کہا جائے گا کہ یہ چند مواضع وہ ہیں جن کی صحت میں نزاع ہے اور ان کو وہ تلقی بالقبول حاصل نہیں ہوئی جو کتاب کے بڑے حصہ کو حاصل ہے۔[1]

حافظ ابن تیمیہؒ منہاج السنہ میں فرماتے ہیں:۔

• تصحیح کے باب میں ائمہ حدیث نے بخاری و مسلم کی تقلید نہیں کی ہے

---

[1] مقدمہ فتح الباری ج ۲ ص ۸۱ ۔

بلکہ جن حدیثوں کی تصحیح ان دونوں اماموں نے کی ہے وہ سب کی سب تقریباً بیس حدیثوں کو مستثنیٰ کر کے امام بخاری و مسلم سے پہلے بھی صحیح تھیں ان کے عہد میں بھی صحیح تھیں اور ان کے بعد بھی صحیح رہیں۔ ائمہ فن نے ان دونوں کتابوں میں بہت غور و خوض کیا اور پھر تصحیح احادیث میں امام بخاری و مسلم سے موافقت کی۔ [1]

---

[1] امام بخاری و امام مسلم کے علاوہ چار ائمہ حدیث اور ہیں جن کے مجموعہائے احادیث کو صحاح قرار دیا گیا ہے۔ امام ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور امام ابن ماجہ رحمہم اللہ۔ ان سب بزرگوں کے تراجم باعث طوالت ہوتے اور پھر ان چار کتابوں کا مرتبہ صحیح بخاری و صحیح مسلم کے بعد ہے جنکریں حدیث بخاری و مسلم کو ہی مان لیں تو بسا غنیمت ہے۔ اس سبب سے ان بزرگوں کے تراجم ترک کرتا ہوں۔

اصولِ درایت

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا اصول روایت کی نسبت تھا۔ اب ہم تحقیق روایات و واقعات کے دوسرے اصول درایت پر کلام کرتے ہیں جو پہلے اصول روایت کی طرح بڑا اہم اصول ہے۔

جس طرح روایت کا اصول قرآن مجید سے ماخوذ ہے۔ اصولِ درایت بھی قرآن مجید نے ہی متعین کردیا تھا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بعض منافقوں نے تہمت لگائی اور اس کا چرچا اس زور وشور سے کیا کہ بعض مسلمان بھی مذبذب ہوگئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

وَلَوْلَآ إِذْ سَمِعْتُمُوهُ قُلْتُم	اور جب تم نے اس خبر کو سنا تو یہ کیوں نہیں
مَّا يَكُونُ لَنَآ أَن نَّتَكَلَّمَ بِهَٰذَا	کہہ دیا کہ ہمیں ایسی بات کہنی مناسب نہیں ہے
سُبْحَٰنَكَ هَٰذَا بُهْتَٰنٌ عَظِيمٌ	سبحان اللہ بڑا بہتان ہے۔

اس آیت میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اس خبر بے بنیاد کو سننے کے بعد تمہیں اس کا ذکر بھی نہیں کرنا چاہیے تھا کیونکہ یہ انتہائی نامعقول بات ہونے کے باعث درایۃً بالکل ساقط الاعتبار تھی۔

درایت کی ابتدا عہد صحابہ میں

درایت کی ابتدا خود صحابہ کرام کے عہد میں ہو چکی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت ابوہریرہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے ایک حدیث بیان کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ "آگ سے پکی ہوئی چیز کے کھانے پر وضو کرنا چاہیے" حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے یہ سنا تو کہا "اگر یہ صحیح ہے تو اس پانی کے پینے سے بھی وضو ٹوٹ جانا چاہیے"۔[1]

[1] ترمذی باب الوضوء

حضرت ابن عباسؓ حضرت ابوہریرہؓ کو ضعیف الروایہ نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن چونکہ ان کی یہ روایت درایت کے خلاف تھی اس لئے انہوں نے اس کو قبول نہیں کیا اور یہ سمجھے کہ حضرت ابوہریرہؓ کو سمجھنے میں غلطی ہوگئی ہے درایت کے اصول میں ایک یہ بھی ہے کہ جو روایت کتاب اللہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی مشہور سنت کے خلاف ہو اسے قبول نہ کرنا چاہئے۔ صحابۂ کرام کا اس پر بھی تعامل تھا وہ ایسی روایت کو صحیح تسلیم نہیں کرتے تھے

حضرت عمرؓ کے سامنے ایک عورت نے کوئی حدیث بیان کی۔ آپ نے اس کے تسلیم کرنے سے انکار کردیا کہ ہم ایک عورت کے کہنے پر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو نہیں چھوڑ سکتے۔ ایک حدیث ہے کہ میت کو اس کے پسماندگان کے نوحہ کی وجہ سے عذاب دیا جائے گا۔ حضرت عائشہؓ نے یہ حدیث سُنی تو اس کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا اور فرمایا کہ یہ قرآن مجید کے حکم کا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی، اور وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی کے خلاف ہے۔ اسی طرح حدیث معراج میں جو آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رویت باری سے مشرف ہوئے۔ تو حضرت عائشہؓ نے اس کی صحت سے بھی انکار کردیا اور فرمایا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لا تدرکہ الابصار۔

ایک مرتبہ حضرت ابوہریرہؓ نے روایت بیان کی کہ برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اُسے دھولینا چاہئے۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ نے یہ سُنا تو فرمایا! اچھا پھر برتن کا کیا ہوگا؟ ان دونوں بزرگوں کا مطلب یہ تھا کہ اگر ہاتھ کو دھوئے بغیر پانی میں ڈالدینے سے پانی ناپاک ہوجاتا ہے تو اس کی وجہ سے برتن (مہراس) بھی ناپاک ہوجائے گا اور ظاہر ہے کہ اس میں بڑا حرج ہے۔ پس ایسا حکم ایک اصل رفع الحرج کے خلاف ہے اور اس لئے اس کی صحت پر اعتبار کرنا مشکل ہے۔

اس سے بھی زیادہ حقیقت افروز ایک اور واقعہ ہے، ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ کے سامنے بدفالی کے متعلق حضرت ابن عمرؓ کی حدیث نقل کی گئی تو آپ نے فرمایا کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو کبھی کبھی اقوالِ جاہلیت بیان فرماتے تھے۔ یعنی ان کی حیثیت محض حکایت کی ہوتی تھی۔ چنانچہ بدفالی کے متعلق بھی ایسا ہی ہے آپ خود یہ حکم کس طرح بیان کر سکتے تھے جبکہ قرآن مجید میں صاف طور پر فرما دیا گیا ہے۔

إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ — تمام حکم اللہ تعالیٰ کے لئے ہی ہے[1]۔

درایت کے اصول تدوینِ حدیث کا دور آیا اور اس کی صحت وغیرہ کے اصول وضوابط متعین کئے گئے تو محدثین نے درایت کے اصول بھی منضبط کئے۔ علامہ سمعانی فرماتے ہیں۔

"صحیح کی پہچان صرف یہی نہیں ہے کہ اس کو ثقہ راویوں نے بیان کیا ہو بلکہ فہم معرفت اور کثرتِ سماع اور مذاکرہ سے بھی اس کو پہچانا جا سکتا ہے"

شیخ ابو اسحاق الشیرازی لمعہ میں لکھتے ہیں۔

"وہ امور جن کی وجہ سے اگر کسی خبر کو ثقہ نے بھی بیان کیا ہو تب بھی اُسے رد کر دیا جاتا ہے۔ یہ ہیں۔

۱۔ جو روایت مقتضیاتِ عقل کے خلاف ہو اس کا باطل ہونا معلوم ہے کیونکہ شرع تو مجوزاتِ عقل کے مطابق ہے نہ کہ اس کے خلاف۔

۲۔ کتاب اللہ کی کسی نص، یا سنتِ متواترہ کے خلاف ہو تو سمجھا جائے گا کہ اس کی کوئی اصل نہیں ہے یا وہ منسوخ ہے۔

۳۔ اجماع کے خلاف ہو۔

۴۔ ایک ہی شخص تنہا کوئی ایسی روایت بیان کرے جس کا علم تمام لوگوں کو ہونا ضروری ہو۔

۵۔ راوی تنہا ایسی روایت بیان کرے جس کو عادۃً اہلِ تواتر کے ذریعہ مروی ہونا چاہیے"

[1] مزید تفصیل کے لئے دیکھو الموافقات الشاطبی ج ۳ ص ۱۹۰، ۲۰۰۔

فتح المغیث میں ہے کہ حدیث کا موضوع ہونا کبھی الفاظ کی عدمِ فصاحت سے بھی معلوم ہوجاتا ہے کیونکہ ظاہر ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم افصح العرب والعجم تھے۔[۱]

علامہ ابن جوزی نے انھیں اصولِ درایت کو ذرا تفصیل سے بیان کیا ہے۔

قال ابن جوزی کل حدیث
رأیتہ یخالف المعقول او
یناقض الاصول فاعلم انہ
موضوع فلا یتکلف اعتبارہ
ای لا تعتبر رواتہ ولا تنظر فی
جرحھم او یکون مما یدفعہ الحس
والمشاھدۃ او مباینا لنص الکتاب
والسنۃ المتواترۃ او الاجماع
القطعی حیث لا یقبل شیٔ من
ذلک التأویل او یتضمن الافراط
بالوعید الشدید علی الامر
الیسیر او بالوعد العظیم علی
الفعل الیسیر وھذا الاخیر کثیر
موجود فی حدیث القصاص
والطرقیۃ ومن رکۃ المعنی لا تاکلوا
القرعۃ حتی تذبحوھا ولذا جعل
بعضھم ذلک دلیلا علی کذب

ابن جوزی نے کہا ہے کہ جس حدیث کو دیکھو
کہ عقل یا اصول کے خلاف ہے تو جان لو کہ
وہ من گھڑت ہے اس کی نسبت اس بحث
کی ضرورت نہیں کہ اس کے راوی معتبر ہیں یا
غیر معتبر۔ اسی طرح وہ حدیث قابلِ اعتبار نہیں
ہے جو حس اور مشاہدہ کے خلاف ہو اور وہ
حدیث بھی غیر معتبر ہے جو نص کتاب، سنت
متواترہ یا اجماع قطعی کے خلاف ہو اور پھر کسی
قسم کی تاویل کی اس میں گنجائش بھی نہ ہو، یا وہ
حدیث جس میں ایک ذرا سی بات پر سخت وعید
دی گئی ہو، یا اس کے برعکس معمولی سے فعل پر
بہت بڑے ثواب کا وعدہ کیا گیا ہو، اس قسم کی
حدیثیں قصہ گو اور بازاری لوگوں کے کلام میں
کثرت سے موجود ہوتی ہیں۔ اس طرح وہ حدیث
بھی ناقابلِ اعتبار ہے جس میں لغویت پائی جائے
مثلاً یہ کہ کدو بغیر ذبح نہ کھاؤ۔ اسی کو دیکھ کر
بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس کا راوی کاذب ہے۔

---

[۱] یہ معلومات مقدمہ فتح الملہم بشرح صحیح مسلم ص ۱۹ سے ماخوذ ہیں۔

راويه وكل هذا من القرائن	یہ تمام قرینے تو وہ ہیں جو روایت میں پائے
في المروي وقد تكون في	جاتے ہیں، کبھی یہ قرائن راوی میں پائے جاتے
الراوي كقصة غياث مع	ہیں۔ مثلاً غیاث کا واقعہ خلیفہ مہدی کے ساتھ
المهدي او انفراده عمن لم	پیش آیا۔ جبکہ کوئی راوی تنہا ایسے شخص سے
يدركه بما لم يوجد عند	روایت کرے جس سے ملاقی نہ ہو یا تنہا کوئی
غيرهما او انفراده بشيء مع	ایسی بات بیان کرے جس کا علم اور لوگوں کو
كونه مما يلزم المكلفين علمه	بھی ہونا ضرور تھا جیسا کہ خطیب نے کفایہ کے
وقطع العذر فيه كما قرره	شروع میں اس کی تصریح کی ہے یا وہ واقعہ
الخطيب في اول الكفاية او	اتنا اہم ہو کہ اس کے نقل کے اسباب وافر
باعث بجسيم يتوفر الدواعي	ہوں۔ مثلاً یہ واقعہ کہ کسی دشمن نے لوگوں کو
على نقله كحصر عدو الحاج	حج کرنے سے روک دیا۔
عن البيت۔[1]	

بقول علامہ شبلی نعمانی اس عبارت کا ماحصل یہ ہے کہ حسب ذیل صورتوں میں روایت اعتبار کے قابل نہ ہوگی اور اس کے متعلق اس تحقیق کی ضرورت نہیں کہ اس کے راوی معتبر ہیں یا نہیں؟۔

(۱) جو روایت عقل کے مخالف ہو۔

(۲) جو روایت اصولِ مسلمہ کے خلاف ہو۔

(۳) محسوسات اور مشاہدہ کے خلاف ہو۔

(۴) قرآن مجید یا حدیث متواتر یا اجماع قطعی کے خلاف ہو اور اس میں تاویل کی

---

[1] فتح المغیث مطبوعہ لکھنؤ ص ۱۱۲۔ اصل کتب میرے سامنے نہیں ہے۔ میں نے یہ عبارت مقدمہ سیرت النبی ص ۳۹، ۴۰ سے لی ہے۔

کچھ گنجائش نہ ہو۔

(۵) جس حدیث میں معمولی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو۔

(۶) معمولی کام پر بہت بڑے انعام کا وعدہ ہو۔

(۷) وہ روایت رکیک المعنی ہو۔ مثلاً کدو کو بغیر ذبح نہ کھاؤ۔

(۸) جو راوی کسی شخص سے ایسی روایت کرتا ہے کہ کسی اور نے نہیں کی اور یہ راوی اس شخص سے نہ ملا ہو۔

(۹) جو روایت ایسی ہو کہ تمام لوگوں کو اس سے واقف ہونے کی ضرورت ہو با ایں ہمہ ایک راوی کے سوا کسی اور نے اس کی روایت نہ کی ہو۔

(۱۰) جس روایت میں ایسا قابلِ اعتنا واقعہ بیان کیا گیا ہو کہ اگر وقوع میں آتا تو سینکڑوں راوی اس کو بیان کرتے۔ اس کے باوجود صرف ایک ہی راوی نے اس کو بیان کیا ہے۔

ملا علی قاریؒ نے موضوعات کے خاتمہ پر حدیثوں کے نامعتبر ہونے کے چند اصول تفصیل سے لکھے ہیں اور ان کی مثالیں نقل کی ہیں ہم اس کا خلاصہ اس موقع پر نقل کرتے ہیں[1]۔

(۱) جس حدیث میں ایسی فضول باتیں ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نہیں نکل سکتیں مثلاً یہ کہ جو شخص لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے خدا اس کلمہ سے ایک پرند پیدا کرتا ہے جس کی ستر زبانیں ہوتی ہیں اور ہر زبان میں ستر ہزار لغت ہوتے ہیں۔

(۲) وہ حدیث جو مشاہدہ کے خلاف ہو مثلاً یہ کہ بینگن کھانا ہر مرض کی دوا ہے۔

(۳) جو حدیث صریح حدیثوں کے مخالف ہو۔

(۴) جو حدیث واقع کے خلاف ہو، مثلاً یہ کہ دھوپ میں رکھے ہوئے پانی سے غسل نہیں کرنا چاہئے کہ اس سے برص پیدا ہوتا ہے (اگرچہ تجربہ کی رو سے یہ مضمون درست ہے)۔

[1] یہ پورا خلاصہ مقدمہ سیرت النبی سے ماخوذ ہے۔

(۵) جو حدیث انبیاء کرام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کلام سے مشابہت نہ رکھتی ہو مثلاً یہ حدیث کہ تین چیزیں نظر کو ترقی دیتی ہیں، سبزہ زار، آب رواں اور خوبصورت چہرہ کا دیکھنا

(۶) وہ حدیثیں جن میں آئندہ واقعات کی پیش گوئی بقیدِ تاریخ مذکور ہو مثلاً یہ کہ فلاں سنہ اور فلاں تاریخ میں یہ واقعہ پیش آئے گا۔

(۷) وہ حدیثیں جو طبیبوں کے کلام سے زیادہ مشابہ ہوں۔ مثلاً یہ کہ ہریسہ کے کھانے سے قوت آتی ہے یا یہ کہ مسلمان شیریں ہوتا ہے اور شیرینی پسند کرتا ہے۔

(۸) وہ حدیثیں جن کے غلط ہونے کے دلائل موجود ہوں۔ مثلاً عوج بن عنق کا قد تین ہزار گز تھا۔

(۹) وہ حدیث جو صریح قرآن کے خلاف ہو۔ مثلاً یہ کہ دنیا کی عمر سات ہزار برس کی ہوگی اگر یہ روایت صحیح مان لی جائے تو ہر شخص بتا دے گا کہ قیامت کب آئے گی حالانکہ قرآن سے ثابت ہے کہ قیامت کا وقت کسی کو معلوم نہیں ہے۔

(۱۰) بعض وہ حدیثیں جو خضر علیہ السلام کے متعلق ہیں۔

(۱۱) جس حدیث کے الفاظ رکیک ہوں۔

(۱۲) بعض وہ حدیثیں جو قرآن مجید کی الگ الگ سورتوں کے فضائل میں وارد ہیں صاحب کشف الاسرار نے بھی قریب قریب ہی لکھا ہے۔

"خبر واحد اگر مقتضیٰ عقل کے خلاف ہو تو ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ اس میں بغیر کسی تکلفِ بارد کے تاویل ہوسکتی ہے یا نہیں۔ اگر تاویل صحیح ہوسکے تو اس خبر کو قبول کر لینا چاہئے ورنہ اسے رد کر دینا چاہئے، اسی طرح جو خبر نص کتاب، سنت متواترہ یا اجماع کے خلاف ہو تو اسے بھی رد کر دینا ضروری ہے کیونکہ یہ تمام دلیلیں قطعی ہیں اور خبر واحد ظنی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ قطعی اور ظنی میں کوئی تعارض نہیں ہوتا بلکہ قطعی کے مقابلہ میں ظنی ساقط ہو جاتا ہے۔" [1]

[1] مقدمہ فتح الملہم بشرح صحیح مسلم ص ۱۸۔

ان اصول کی بنا پر ہر زمانہ میں روایت پر تنقید کی گئی ہے۔ حافظ ابن حجر روایت معراج کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ثابت کی روایت میں جو فی "ربطتہ بالحلقۃ" میں نے براق کو حلقہ سے باندھ دیا۔ آیا ہے تو حضرت حذیفہ اس کی صحت سے انکار کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے براق کو اس لیے باندھ دیا تھا کہ اس کے بھاگ جانے کا اندیشہ تھا؟ بھلا یہ کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ اللہ نے اس وقت آپ کے لئے عالم غیب و شہادت کو مسخر کر دیا تھا۔

اسماعیلی بخاری کی روایت جس کا مضمون یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اپنے والد آزر سے قیامت کے دن اس حال میں ملیں گے کہ آزر کے چہرہ پر تار کول ملا ہوا ہوگا۔ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اس خبر کی صحت میں نظر ہے اور دلیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔ پس جب اللہ تعالیٰ ان سے وعدہ کر چکا ہے کہ وہ قیامت کے دن ان کے باپ آزر کو رسوا نہیں کرے گا تو پھر اس کے خلاف کس طرح کر سکتا ہے۔

حافظ ابن حجر حدیث ابی ہریرہؓ

خلق اللہ آدم وطولہ	اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو پیدا کیا اور
ستون ذراعا	ان کا طول ساٹھ گز تھا۔

کے متعلق کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "امم گذشتہ کے جو آثار ثمود کے دیار کی طرح سے ہوئے پائے جاتے ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قد و قامت ترتیب سابق کے اقتضا کے مطابق بہت زیادہ طویل نہیں تھے۔ حالانکہ ان کا زمانہ بھی بہت قدیم ہے۔ اور جو زمانہ قوم ثمود اور حضرت آدمؑ کے درمیان ہے وہ اس زمانہ سے کم ہے جو قوم ثمود اور امت مسلمہ کے شروع زمانہ کے درمیان ہے۔ اب تک مجھکو اس اشکال کا حل معلوم نہیں ہوا۔" [۱]

[۱] فتح الباری ج ۶ ص ۲۰۲ طبع جدید

اس تقریر سے یہ واضح ہوا ہوگا کہ محدثین نے تحقیق کے دونوں اصول روایت اور درایت دونوں کی تعیین و تشخیص میں اور ان پر عمل کرنے میں یکساں اہتمام کیا۔ اور تنقید روایات میں دونوں سے کام لیا ہے۔ تاہم اس میں شبہ نہیں کہ بعض خاص خاص محدثین دار قطنی وغیرہ نے اسناد پر زیادہ زور دیا ہے اور حدیث کے متن کی طرف اتنا اعتنا نہیں کیا لیکن اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ محدثین یہ سمجھتے تھے کہ اصول درایت ہر شخص کو معلوم ہو سکتے ہیں جو قرآن اور اجماع کا واقف ہو اور عقل سلیم رکھتا ہو صرف ایک اسناد کا فن ہی ایسا دقیق اور مشکل ہے کہ محدثین کے سوا دوسروں کو اس کا علم نہیں ہوتا۔

اب روایت اور درایت کے ان اصولوں کو اور محدثین نے ان کی تحقیق و تاکید میں جو کوششیں کی ہیں ان سب پر غور کرو اور بتاؤ کیا کسی روایت کی توثیق و تصدیق کے لئے اس سے بلند کوئی اور معیار ہو سکتا ہے؟ کیا دنیا کی تاریخ میں کوئی ایک قوم بھی ایسی ہے جس نے اسناد اور متن کے ہر ممکن سے ممکن پہلو کو سامنے رکھکر اس کی چھان بین میں انسانی کوشش کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا ہو؟ اسناد میں عقلی اعتبار سے جتنے احتمالات ہو سکتے ہیں ان سب پر ان بزرگوں نے مبصرانہ نگاہ ڈالی اور احتیاط کا یہ عالم کہ جہاں کذب کا ذرا سا شائبہ بھی نظر آیا اُسے فوراً ترک کر دیا۔ اسی طرح متن حدیث کی صحت معلوم کرنے کی غرض سے محدثین نے درایت کے اصول متعین کئے۔ لفظ، معنی، عبارت اور طرز بیان ہر ہر لحاظ سے اس کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھا۔ صحیح، ضعیف اور موضوع، ان کے الگ الگ خصائص بیان کئے، ان کے اوصاف متعین کئے اور تمام ذخیرہ ہائے حدیث کو کنگھال کر ہر ہر حدیث پر حکم لگایا اور ایک نوع کو دوسرے سے الگ کر دیا۔

امام بخاری، امام مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی، اور ابن ماجہ رحمہم اللہ اجمعین نے جس طرح ڈھونڈ ڈھونڈ کر صحیح احادیث جمع کیں اور ان کو مرتب کرکے شائع کیا۔[۱] اسی طرح بعض

[۱] چنانچہ امام بخاریؒ امام نسائیؒ، امام صغانی، امام مسلم، علامہ ابن جوزی نے کتاب الضعفاء (باقی حاشیہ ص۔ ...)

محدثین نے موضوع حدیثوں کو جمع کیا اور ان کو کتاب کی شکل میں ترتیب دیا۔ تاکہ بحکم وبضدها تتبین الاشیاء روایات کو دیکھکر لوگوں کو ان کی پہچان ہو جائے۔ پھر رواۃ پر جو کتابیں لکھی گئیں ان میں ایک ایک راوی حدیث کے حالات بکمال دقیق النظری تحقیق و تفتیش کرنے کے بعد لکھے گئے۔ یہاں تک کہ اب ایک راوی بھی ایسا نہیں ہے جس پر محدثین نے کلام نہ کیا ہو۔ پھر جو ثقہ راوی تھے ان پر الگ اور جو ضعیف تھے ان پر الگ اور جو مدلس یا وضاعین وکذابین تھے ان پر الگ ضخیم ضخیم کتابیں لکھیں، سب کے چہروں سے نقاب اٹھا کر اصل حقیقت کو بے حجاب کر کے رکھ دیا۔ انھوں نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ایک دوسرے سے اس طرح تمیز کر دیا کہ آج صاحب چشم بصیرت بے تکلف دونوں میں خط امتیاز کھینچ سکتا ہے۔

علامہ ابن قتیبہ نے اپنی کتاب تاویل مختلف الحدیث کے شروع میں منکرین کے وہ اعتراضات نقل کئے ہیں جو وہ محدثین پر کرتے ہیں۔ محدثین کی طرف سے ان اعتراضات کا جواب دینے کے بعد لکھتے ہیں۔

واصحاب حدیث نے حق اس کی اپنی جگہ سے طلب کرنا چاہا ہے اور ان کی خواہش یہی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سنن کا اتباع کر کے اللہ کا تقرب حاصل کریں۔ محدثین سنن معلوم کرنے کے بعد بحر و بر ان کی تحقیق تفتیش اور چھان بین میں لگے رہے۔ یہاں تک کہ انھوں نے ان کے صحیح اور سقیم میں، ناسخ اور منسوخ میں پوری بصیرت کے ساتھ امتیاز کر لیا۔ اور فقہاء میں سے جو ارباب رائے سنن کے خلاف تھے ان کو بھی انھوں نے پہچان لیا اور لوگوں کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۹) یا موضوعات کے نام سے کتابیں لکھیں (کشف الظنون ج ۲ ص ۹۰) ان کے علاوہ ملا علی قاری نے موضوعات اور علامہ محمد طاہر بن علی نے تذکرۃ الموضوعات لکھی جس کے ذیل میں قانون الموضوعات والضعفاء بھی ہے۔

> اس پر متنبہ کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حق ظاہر ہو گیا جبکہ وہ مٹنے کے قریب تھا اور وہ اہلہانے لگا۔ جبکہ اس پر پژمردگی کا غلبہ ہو چلا تھا اور سنن کے وہ لوگ بھی مطیع ہو گئے جو ان سے انحراف کرتے تھے اور جو پہلے ان سے غفلت برتتے تھے۔
>
> ان میں اب بیداری پیدا ہو گئی۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوالِ طیبہ کے مطابق احکام صادر ہونے لگے جبکہ فلاں فلاں لوگوں کے انتساب سے حکم دیا جاتا تھا۔

محدثین کرام نے اپنی عمریں صرف کر کے طرح طرح کے مصائب و آلام برداشت کر کے صحیح و غیر صحیح دونوں قسم کی احادیث مرتب کر دی ہیں، ان کے مجموعے آج ہمارے سامنے موجود ہیں، تنقید کے اصول الگ ہم کو بتا دئے گئے ہیں۔ آج اگر کوئی حدیث آپ کی سمجھ میں نہ آئے تو بے شک آپ کو حق ہے کہ اصول کی روشنی میں اس پر کلام کریں جس طرح زمانۂ سلف کے محدثین و ناقدین نے کیا تھا۔ لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ آپ اپنی آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے بیک جنبش قلم محدثین کی سالہا سال کی محنتوں اور جانکاہیوں پر خطِ نسخ کھینچ دیں جن کی کوششیں آج اصل دین کی حفاظت و بقا کی کفیل ہیں اور جن کو ہر زمانہ میں قبول عام حاصل رہا ہے۔ بازار میں بے ایمانی اور مکاری و فریب دہی کے عام ہو جانے کی وجہ سے اگر خالص گھی اور دودھ کا ملنا کمیاب ہو گیا ہے تو یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ آپ سرے سے گھی اور دودھ کا استعمال ہی ترک کر دیں۔ حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ بدن میں طاقت پیدا کرنے کے لئے ان دونوں کا استعمال از بس ضروری ہے اور پھر چند مخلص و نیک نیت اور ایماندار دکاندار ایسے بھی ہیں جو خالص گھی اور دودھ فراہم کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔

صحابہ کرامؓ کی سیرت سے متعلق جو روایات ہیں۔ اگر وہ تاریخی اعتبار سے صحیح ہیں، (اور غالباً اس سے انکار منکرینِ حدیث کو بھی نہیں ہے) تو ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ اس کی

کیا وجہ ہے کہ وضاعین وکذابین کی وجہ سے اگرچہ صحابہ کرامؓ روایات کے قبول کرنے میں بڑی احتیاط کرتے تھے لیکن یہ انھوں نے نہیں کیا کہ وضع حدیث کے خوف سے روایت کا قبول کرنا ہی مطلقاً ترک کر دیا ہو۔

اسی طرح علامہ ابن جوزی وغیرہ نے بخاری تک کی بعض حدیثوں کی تضعیف کی۔ لیکن یہ انھوں نے بھی نہیں فرمایا کہ جب بخاری ایسی صحیح اور مستند کتاب میں بعض ضعیف حدیثیں درج ہو گئی ہیں تو اب اس کا اور کسی اور کتاب حدیث کا اعتبار باقی نہیں رہا۔ اس لئے حدیث کو ہی تسلیم نہ کرنا چاہئے۔

کیا عجب تماشہ ہے کہ آج منکرین حدیث انکار حدیث کے لئے استدلال کرتے ہیں تو اس میں محدثین کے ہی بنائے ہوئے اصول سے کام لیتے ہیں۔ انھیں کے بنائے ہوئے ضعیف راوی کو ضعیف اور وضاع کو وضاع کہتے ہیں۔ مثلاً ایک دو حدیثیں پیش کر کے وہ کہتے ہیں کہ دیکھئے یہ قرآن کے خلاف ہیں۔ اس لئے ناقابل اعتبار ہیں۔ ہم کہتے ہیں یہ آپ نے نئی بات کیا کہی؟ یہ تو خود محدثین اصولِ درایت کے سلسلہ میں بیان کر چکے ہیں کہ جو حدیث نص کتاب اور سنت متواترہ کے خلاف ہو اسے رد کر دینا چاہئے۔ بس ضرورت اس کی ہے کہ آپ ان دو حدیثوں کا نص کتاب کے مخالف ہونا ثابت کر دیں۔ اگر آپ اس میں کامیاب ہو گئے تو ہم بھی آپ کے ہمنوا ہو کر کہیں گے کہ بے شبہ ان حدیثوں کو قبول نہ کرنا چاہئے۔ لیکن اس سے زیادہ سے زیادہ یہی تو لازم آیا کہ یہ دو ایک حدیثیں قرآنی نص کے مخالف ہونے کی وجہ سے مسترد ہو گئیں۔ اس سے یہ نتیجہ کس طرح لازم آگیا کہ ان دو ایک حدیثوں کی وجہ سے پورا ذخیرۂ احادیث ہی ناقابلِ اعتبار قرار پا جائے۔

منکرین حدیث کو غور کرنا چاہئے کہ اگر وہ کسی ضعیف راوی کو ضعیف۔ کسی وضاع کو وضاع کہنے میں محدثین کی رہنمائی کے محتاج ہیں اور انھیں کے قول پر اعتبار کرنے پر مجبور ہیں تو پھر اس چیز میں ان کے اقوال کو معتبر ماننا اور حکم حدیث میں ان کو ناقابلِ اعتبار قرار دینا

حد درجہ کی ناانصافی اور زیغ قلب کی دلیل نہیں تو کیا ہے؟ ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا وھب لنا من لدنک رحمۃ انک انت الوھاب۔

سوال یہ ہے کہ آپ کو آج اس کا یقین کیونکر آیا کہ لوگ وضع حدیث کرتے تھے؟ محض محدثین وارباب تاریخ کے کہنے سے! پس اگر آپ ان کے اس قول کو صحیح مانتے ہیں تو جب وہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے اسے درست تسلیم کیوں نہیں کرتے۔

ظنیت حدیث اس موقع پر یہ بیان کردینا ضروری ہے کہ منکرین حدیث عموماً یہ کہتے ہیں کہ محدثین کی تصریح کے مطابق اخبار آحاد مفید ظن ہیں یعنی ان سے یقین حاصل نہیں ہوتا اور قرآن مجید میں بحکم اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا ظن کے قبول کرنے سے منع فرمایا گیا ہے اس لئے احادیث ناقابل قبول ہیں۔

اس دلیل کے جواب میں حضرت الاستاذ مولانا شبیر احمد عثمانی شارح صحیح مسلم نے مقدمہ فتح الملہم میں بہت واضح تقریر کی ہے۔ ہم اس کا خلاصہ ذیل میں درج کرتے ہیں۔

مشہور یہ ہے کہ اخبار آحاد قرائن سے مجرد ہوں تو ظن کا فائدہ دیتے ہیں اور متواتر علم یقین کا۔ اب ہم ظن کے معنی کی تشریح کرتے ہیں۔

امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں۔

ظن اس کیفیت کا نام ہے جو کسی علامت سے حاصل ہو۔ یہی کیفیت قوی ہوجاتی ہے تو علم بن جاتی ہے اور جب حد سے زیادہ ضعیف ہوجاتی ہے تو توہم کی حد سے متجاوز نہیں ہوتی۔ پس اللہ تعالیٰ کا ارشاد اَلَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّھِمْ اور نیز یظنون انھم ملاقوا اللہ ان دونوں میں ظن بمعنی یقین ہے۔ اس کے برخلاف ان آیتوں

اِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْہِ	وہ لوگ جنہوں نے اس میں اختلاف کیا ہے
لَفِیْ شَکٍّ مِّنْہُ مَا لَھُمْ	وہ بے شبہ اس کے متعلق شک وشبہ میں پڑے

بہ من علم الا اتباع الظن — ہیں ان کو اس کا کوئی علم نہیں ہے۔ بجز ظن کی پیروی کے اور کچھ نہیں۔

اور وَتَظُنُّونَ بِاللّٰهِ الظُّنُونَا — تم اللہ کی نسبت طرح طرح کے گمان کرتے ہو۔

اور وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا۔ — ظن حق کا کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔

یہاں ظن سے مراد وہ اوہام ہیں جو کسی صحیح دلیل کے بغیر پیدا ہوتے ہیں۔ قرآن مجید سے ظن کے معنی کی اسی تعیین وتشخیص کے بعد اب دیکھنا چاہئے کہ محدثین کے نزدیک ظن سے مراد کیا ہوتی ہے۔

پس ظن جس کا فائدہ خبر واحد دیتی ہے وہ کیفیت قوی راجح ہے جو قریب بہ یقین ہو، نہ وہ ضعیف مرجوح جو حد توہم سے متجاوز نہیں ہوتی۔ اور ظن بمعنی اول علم کی ایک نوع ہے جس پر اکثر احکام دینی ومعاملات دنیوی کا دار ومدار ہے۔ لیکن یہ لفظ مختلف معانی میں مشترک ہونے اور وہم کے معنی میں شائع ہوجانے کی وجہ سے اکثر اشتباہ والتباس کا باعث بن جاتا ہے، اس لئے بہتر یہ ہے کہ اس سے احتراز کیا جائے اور اس قسم کے مقامات میں اس کو استعمال نہ کیا جائے۔

امام فخر الاسلام نے اسی وجہ سے خوب کہا ہے کہ متواتر سے علم یقین اور مشہور سے علم الطمانیت پیدا ہوتا ہے اور خبر واحد سے علم غالب الرائے کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اسی بنا پر جو شخص اخبار آحاد پر عمل پیرا ہوتا ہے گویا وہ اس چیز کی پیروی کرتا ہے جس کا اسے علم حاصل ہے۔ اس کو ہم اتباع ظن جو مذموم ہے نہیں کہہ سکتے۔ خبر واحد کا قبول کرنا واضح ضرورتوں میں سے ہے۔ جس سے انکار بجز ایک منکر مکابر کے کوئی اور نہیں کر سکتا۔ ہم شب وروز

اپنے معاملات میں اس پر عمل کرتے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر مسئلہ اور ہر واقعہ میں ہر خبر واحد کے قبول کرنے کی حیثیت بالکل یکساں ہوتی ہو بلکہ وجدان صحیح اخبار کے باہمی فروق و مراتب کا خود بخود حکم کر دیتا ہے۔ فرض کیجئے، ایک شخص کہتا ہے کہ فلاں صاحب آپ کو بلاتے ہیں تو آپ کو یہ سُنکر تردد نہیں ہوتا اور اس بات کا یقین آجاتا ہے۔ لیکن اگر یہی شخص آپ سے کہے کہ آپ کو بادشاہ نے اپنی محفل میں بلایا ہے تو اس خبر کو سُن کر آپ کے دل میں اختلاج و انقباض پیدا ہو جاتا ہے اور انشراحِ صدر اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کہ قرائن و شواہد سے اس کی تائید نہیں ہو جاتی۔ یہی مراد ہے ان لوگوں کی جو کہتے ہیں کہ شہادت بہ قدر دعویٰ اور دلیل بمرتبۂ مدلول ہونی چاہیے۔ ہمارے علماء محققین کا تعامل اسی پر ہے[1]۔ منہ

اس تقریر پر ہم اتنا اضافہ اور کرنا چاہتے ہیں کہ قرآن مجید میں واقعۂ افک کے بارہ میں ہے۔

لَوْلَآ إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنفُسِهِمْ خَيْرًا۔	تم لوگوں نے جب یہ خبر سنی تھی تو مومن مردوں اور عورتوں نے کیوں اچھی بات کا ظن نہیں کیا۔

اس آیت سے جہاں یہ معلوم ہوتی ہے کہ ظن احتمالِ مرجوح کے معنی میں نہیں آتا بلکہ وثوق کے ساتھ کسی شے کے جاننے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اگر کسی شے کے متعلق گمانِ غالب پیدا کرنے کے لئے قرائن و آثار موجود ہوں جیسا کہ واقعۂ افک میں حضرت عائشہؓ کی عصمت مآبی و پاک دامنی کا گمان غالب پیدا کرنے کے لئے قرائن موجود تھے تو ہمیں اس پر وثوق اور بھروسہ کر لینا چاہیے اور اگر ہم قرائن کی شہادت کے

[1] مقدمہ فتح الملہم ص ۸۔

باوجود ایسا نہیں کریں گے تو اس پر ہم سے ایسا ہی مواخذہ ہوگا جیسا کہ آیت بالا میں منافقین کی اڑائی ہوئی خبر کو سنکر حضرت عائشہؓ کے معاملہ میں مذبذب ہوجانے والے مسلمان مردوں اور عورتوں سے ہوا۔

ظن کے معنی کی اس تحقیق و تنقیح کے بعد یہ مسئلہ خود بخود واضح ہو جاتا ہے کہ احادیث سے جو فائدہ ظن حاصل ہوتا ہے اس کی بنا پر حدیثیں کس حد تک قابلِ عمل ہیں اور ان سے احکام کے استنباط میں اور قرآن مجید کی مختلف الاحتمالات آیات کے معانی کی تعیین میں کس حد تک مدد لی جا سکتی ہے۔

فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ

محدثین کی بے لوث خدمات علم ومذہب

بعض لوگ حدیث کی بے اعتباری ثابت کرنے کے لئے یہ بھی کہتے ہیں کہ حدیث کی تدوین چونکہ خلفائے بنی امیہ اور خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں ہوئی ہے۔ اور بعض ائمہ حدیث مثلاً امام زہریؒ خلفاء سے راہ ورسم رکھتے تھے اس لئے حدیث کا ذخیرہ وقت کے عام سیاسی اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکا۔

اب آیئے تاریخ کی روشنی میں یہ دیکھیں کہ یہ بدگمانی کہاں تک صحیح ہے! یہ ہر شخص کو معلوم ہے کہ خلفائے بنی امیہ سیاسی حیثیت سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سخت مخالف تھے اور اسی طرح خلفائے بنی عباس حضرت معاویہؓ کو اپنا زبردست سیاسی حریف سمجھتے تھے اس بنا پر اگر محدثین نے ان خلفاء کی جنبہ داری کی ہوتی تو بنو امیہ کے عہد میں حدیثوں کا دفتر حضرت معاویہؓ کے مناقب اور حضرت علیؓ کے مثالب سے بھرا نظر آتا اور پھر خلفائے عباسیہ اپنے عہد میں حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کی منقبت میں اور حضرت معاویہؓ کی مذمت میں کثرت سے حدیثیں روایت کرواتے لیکن ذخیرۂ احادیث کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی حدیثوں سے دفتر احادیث خالی ہے۔ اور مناقب صحابہ کے ذیل میں حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے فضائل بیان بھی کئے گئے ہیں تو ان میں کوئی خاص بات نہیں ہے انھیں کی کیا خصوصیت ہے اور صحابہ کے فضائل بھی مذکور ہیں اور کہیں کسی کتاب میں اگر اس قسم کی کوئی حدیث ہے بھی جس سے بیجا حمایت کی بو آتی ہو تو اسے محدثین نے موضوع بتا کر ساقط الاعتبار قرار دیدیا ہے۔

پھر محدثین کے واقعات زندگی دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ گدایان سکندر دل کس استغنا کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اور بے لوث وبے غرض ہونے کی وجہ سے امر بالمعروف ونہی عن المنکر

میں بڑے سے بڑے جابر و ظالم بادشاہ کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ علم و بصیرت کی روشنی میں جو بات انھیں حق معلوم ہوتی تھی اسے برملا کہتے تھے اور جان و مال، عزت و آبرو کسی چیز کا خیال اعلانِ حق سے انھیں باز نہیں رکھ سکتا تھا۔ خلفاء سے راہ و رسم رکھنے میں امام زہریؒ اور امام مالکؒ کا نام زیادہ نمایاں ہے۔ لیکن ان دونوں بزرگوں کا بھی حال یہ تھا کہ حق کے معاملہ میں خلیفہ کی رضاجوئی کی ذرا پرواہ نہیں کرتے تھے۔

ایک مرتبہ ولید بن عبدالملک نے امام زہریؒ سے کہا کیا تم کو یہ روایت پہنچی ہے کہ جن لوگوں نے حضرت عائشہؓ پر تہمت لگائی ان میں علیؓ بھی داخل تھے؟ امام زہریؒ نے فرمایا "نہیں" البتہ تمہاری قوم کے دو آدمی یعنی ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن اور ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث نے مجھ سے روایت کی کہ حضرت عائشہؓ نے ان سے کہا کہ علیؓ اس الزام سے بری تھے۔

ایک روایت میں ہے کہ ہشام بن عبدالملک کا خیال تھا کہ قرآن مجید میں حضرت عائشہؓ کے واقعۂ افک کے سلسلہ میں جو

وَالَّذِیْ تَوَلّٰی کِبْرَہٗ مِنْھُمْ	جس نے ان میں سے اس الزام میں بڑا حصہ لیا
لَہٗ عَذَابٌ عَظِیْمٌ۔	ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔

فرمایا گیا ہے تو اس سے مراد حضرت علیؓ ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ سلیمان بن یسار ہشام کے پاس آئے تو اس نے پوچھا والذی تولی کبرہ سے کون مراد ہے؟ وہ بولے "عبداللہ بن ابی" ہشام بولا "جھوٹ کہتے ہو وہ علیؓ ہیں" انھوں نے کہا "امیرالمومنین جو کچھ کہتے ہیں وہی اس کو خوب جانتے ہیں پھر زہریؒ آئے تو ان سے بھی یہی سوال کیا اور انھوں نے وہی جواب دیا جو سلیمان بن یسار نے دیا تھا اس نے کہا تم جھوٹ کہتے ہو وہ علیؓ ہیں۔ انھوں نے کہا "میں جھوٹ کہونگا؟ تمہارے باپ نہ ہو اگر آسمان سے ایک منادی پکارے کہ خدا نے جھوٹ جائز کر دیا میں تب بھی جھوٹ نہ بولوں گا۔ مجھ سے عروہ، سعید، عبداللہ اور علقمہ نے حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے کہ وہ عبداللہ بن ابی تھا۔ اس واقعہ کے اخیر میں ہے کہ ہشام نے کہا "ہم نے اس بڈھے کو غصہ دلا دیا۔"[۱]

[۱] فتح الباری ج ، ص ۳۳۶ ، ۳۳۷ طبع قدیم

اسی قسم کا بلکہ اس سے زیادہ صاف واقعہ حضرت اعمش کا ہے۔ ایک مرتبہ ہشام بن عبدالملک نے ان کو لکھا کہ آپ حضرت عثمانؓ کے فضائل اور حضرت علیؓ کے معائب قلمبند کر لیجئے انھوں نے خط بکری کے منہ میں ڈالدیا جو اس کو چبا گئی، پھر قاصد سے کہا جا کر کہدینا یہی تمہارا جواب ہے۔ قاصد بولا "خلیفہ نے قسم کھائی ہے اگر میں جواب لیکر نہ پہنچا تو وہ مجھ کو قتل کر دے گا" یہ سنکر حضرت اعمش نے مجبوراً جواب لکھا "اے امیر المؤمنین اگر حضرت عثمانؓ میں تمام دنیا کی خوبیاں ہوں تو وہ تمہارے لئے مفید نہیں اور اگر حضرت علیؓ میں تمام جہان کی برائیاں ہوں تو وہ نقصان رساں نہیں صرف اپنی ہی ذات کا خیال رکھو"[1]

حجاج بن محمد بن یوسف ثقفی ظلم وستم کی دنیا کا نمایاں ہیرو ہے، ایک مرتبہ اس کے سامنے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا ذکر آیا تو اس نے کہا "وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذریات میں داخل نہ تھے" اس مجلس میں یحیٰی بن یعمر موجود تھے انھوں نے کہا "اے امیر تو جھوٹ بولتا ہے" بولا "اس پر قرآن سے دلیل لاؤ ورنہ میں تم کو قتل کردوں گا" انھوں نے یہ آیت پڑھی۔

وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ	انہیں کی نسل میں سے داؤد، سلیمان
وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَ	ایوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون میں۔
هٰرُوْنَ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى	اور ہم نیک کام کرنے والوں کو ایسا ہی صلہ
الْمُحْسِنِيْنَ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَ	دیتے ہیں اور ایسے ہی ہیں زکریا، یحییٰ
عِيْسٰى وَاِلْيَاسَ۔	اور الیاس علیہم السلام ہیں۔

اور پھر کہا حضرت عیسیٰ علیہ السلام ماں کے ذریعہ سے حضرت آدمؑ کی نسل میں داخل ہیں، بس اسی طرح حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی ماں کے واسطہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذریت میں داخل ہیں۔ حجاج بولا "تم کہتے تو سچ ہو، لیکن یہ بتاؤ تم نے میری مجلس میں مجھ کو کیوں جھٹلایا" فرمایا اس معاہدۂ خداوندی کی وجہ سے۔

[1] ابن خلکان ج ۲ ص ۲۱۳ و ۲۱۴

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ	اور جب اللہ نے اہل کتاب سے یہ وعدہ لیا کہ
اُوْتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ	وہ کتاب کو لوگوں کے سامنے بیان کریں گے
وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ فَنَبَذُوْهُ وَرَاۗءَ	اور اس کو چھپائیں گے نہیں ان لوگوں نے
ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا	اس قول و قرار کو پس پشت ڈال دیا۔

حجاج اس حق گوئی کی تاب نہ لا سکا اور حضرت یحییٰ بن یعمر کو خراساں کی طرف جلا وطن کر دیا۔[1]

امام اوزاعی شام کے امام تھے وہ خود اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ جب سفاح کا چچا عبداللہ بن علی شام میں آیا تو اس نے ایک دربار منعقد کیا اور اس میں مجھ کو بلایا۔ میں وہاں پہنچا تو سواری سے اتار لیا گیا اور دو آدمیوں نے میرے بازو پکڑ کر مجھ کو ایسے مقام پر کھڑا کر دیا جہاں سے وہ میرا کلام سن سکے۔ اب اس نے پوچھا "عبدالرحمٰن بن عمرو الاوزاعی تمہارا ہی نام ہے؟" میں نے کہا "اللہ امیر کی اصلاح کرے یہ میرا ہی نام ہے" بولا "بنو امیہ کی خونریزی کی نسبت تمہارا کیا خیال ہے؟" میں نے کہا "تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ تھا۔ اس لئے مناسب یہ تھا کہ تم اس کو پورا کرتے" وہ بولا "ہمارے اور ان کے درمیان کوئی معاہدہ نہیں تھا۔ اوزاعی فرماتے ہیں۔ اس وقت میرا دل سراسیمہ ہو گیا۔ لیکن قیامت کے دن خدا کے خوف کا تصور کیا تو یہ ذرا در اضطراب جاتا رہا۔ اس لئے میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ بنو امیہ کا خون تم پر حرام تھا وہ یہ سن کر اس قدر برہم ہوا کہ آنکھیں نکل آئیں اور گردن کی رگیں پھول گئیں۔ کہنے لگا "خدا تم پر رحم کرے تم نے ایسا کیونکر کہا" میں نے کہا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کسی مسلمان کا خون اس وقت تک جائز نہیں جب تک تین حالتوں میں سے ایک حالت پیش نہ آئے، یا تو اس نے شادی شدہ ہونے کی حالت میں زنا کیا ہو یا کسی کو قتل کر دیا ہو یا وہ مرتد ہو گیا ہو" عبداللہ بن علی نے کہا "کیا ہماری حکومت دینی نہیں ہے؟ میں نے کہا کیونکر؟ کہنے لگا "کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کے لئے وصیت نہیں کی تھی" میں نے کہا "اگر وصیت

[1] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۶۷۔

کی ہوتی تو دو شخصوں کو حکم نہ بتلاتے" اس پر وہ مارے غصہ کے آگ بگولا ہو گیا۔ اب مجھے یقین تھا کہ میرا سر قدموں پر گرا چاہتا ہے۔ لیکن اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ ان کو نکالدو۔ میں وہاں سے نکل کر تھوڑی دور آیا تھا کہ میرے پاس ایک سوار آیا۔ میں سمجھا یہ میرا سر کاٹنے آیا ہے اس خیال سے میں سواری سے اترا کہ دو رکعت نماز پڑھ لوں۔ اس نے سلام کیا اور کہا کہ امیر نے آپ کے پاس دنانیر بھیجے ہیں، امام ہمام نے یہ دینار قبول تو کر لئے لیکن فیاضی اور سیر چشمی کا یہ عالم تھا کہ گھر پہنچتے پہنچتے ختم کر دیئے۔[1]

یہ چند واقعات مشتے نمونہ از خروارے ہیں ورنہ محدثین کرام کی زندگیوں کا مطالعہ کیجئے آپ بے شمار واقعات اسی قسم کے نظر آئیں گے۔ کسی حاکم وقت یا بادشاہ کی استرضاء کے لئے حدیثیں وضع کرنا تو بہت بڑی بات ہے۔ کوئی محدث کسی جزئی مسئلہ میں جو رائے رکھتا تھا وہ بادشاہ کی رضامندی کے لئے اس کے اعلان و اظہار سے بھی باز نہیں آتا تھا۔ امام مالکؒ فرماتے تھے "جبری طلاق واقع نہیں ہوتی" منصور نے اس پر ناراض ہو کر ان کو نہایت بے رحمی کے ساتھ ذلیل کیا۔ لیکن امام جنت مقام پھر بھی یہی کہتے رہے "جو مجھ کو جانتا ہے وہ جانتا ہے اور جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں انس کا بیٹا مالک ہوں اور کہتا ہوں کہ طلاق مکرہ واقع نہیں ہوتی اور اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

امام احمد بن حنبلؒ کو دُرّوں سے مارا گیا۔ شدید سے شدید عقوبت دی گئی لیکن وہ بدستور اسی کا اعلان کرتے رہے القرآن کلام اللہ غیر مخلوق تو کیا ائمہ دین جو کہ فقہی مسائل تک میں حکومت کی مخالفت اور جسمانی تکلیف و اذیت کی مطلق پروا نہیں کرتے تھے۔ ان سے یہ توقع ہو سکتی ہے کہ انھوں نے خود احادیث وضع کی ہوں گی یا احادیث موضوعہ کے قبول کرنے میں تساہل و تغافل سے کام لیا ہوگا؟ سبحانک ھذا بھتان عظیم

محدثین کرام کی یہ جماعت مادی اعتبار سے کتنی ہی بے بضاعت اور بے سروسامان ہو

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۷۰ تا ۱۷۱۔

لیکن حق یہ ہے کہ یہ لوگ گدایانِ دارا دل وسکندر دماغ تھے۔ اپنے ذریعہ معاش سے انھیں جو کچھ ملتا تھا اس پر صبر وشکر کے ساتھ قناعت کرتے تھے اور کسی سلطنت وحکومت کے جاہ وجلال اور دولت وثروت کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے تھے۔ حضرت سعید بن المسیب کے پاس چار سو دینار تھے وہ اسی سے تجارت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ خلافت بنو امیہ کی جانب سے ان کی خدمت میں ۳۰ ہزار درہم پیش کئے گئے لیکن انھوں نے فرمایا

لاحاجۃ لی فیہا ولا فی	مجھکو نہ درہموں کی ضرورت ہے اور نہ بنو مروان
بنی مروان حتی القی اللہ	کی۔ یہاں تک کہ میں اللہ سے ملوں اور وہ میرے
فیحکم بینی وبینھم [1]	اور ان کے درمیان فیصلہ کرے۔

خلفاء سے ان بزرگوں کی بے نیازی کا اندازہ اس سے ہوگا کہ عبد الملک بن مروان نے ہر چند چاہا کہ حضرت سعید بن المسیب اپنی صاحبزادی کا نکاح اس کے لڑکے اور ولی عہد ولید سے کردیں لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوئے۔ یہاں تک کہ ایک دن جب شدید سردی پڑرہی تھی، عبد الملک نے انھیں بٹھایا اور ان پر پانی بہانے کا حکم دیا۔ [2]

محدثین کی احتیاط کوشی کا یہ عالم تھا کہ اتقوا مواضع التہم کے مصداق خلفاء اور امراء کے عطیات اور تحائف بھی قبول نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ جعفر برمکی نے حضرت عیسیٰ بن یونس کو ایک لاکھ درہم پیش کئے تو انھوں نے بہ کمال استغناء یہ کہکر واپس کردیا کہ کہیں اہل علم یہ نہ کہیں کہ میں نے حدیث کی قیمت لے لی۔[3] مامون رشید نے بھی ان کو دس ہزار کی رقم دینی چاہی لیکن انھوں نے اس کے قبول کرنے سے بھی انکار کردیا اور فرمایا ولا شربت ماء یعنی حدیث کے معاوضہ میں تو میں ایک گھونٹ پانی بھی قبول نہیں کرونگا۔[4]

ایک بار امیر یمن نے حضرت طاؤس بن کیسانؒ کی خدمت میں پانچسو دینار بھیجے لیکن انھوں نے ان کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ امام ابو حنیفہؒ تجارت کرکے زندگی بسر کرتے تھے۔

---

[1] ابن خلکان ج ا ص ۲۰۶ [2] ایضاً ج ا ص ۲۰۰ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۲۵۰ [4] ایضاً ج ا ص ۲۵۹

اور سلاطین کے عطیات قبول نہیں کرتے تھے۔ خلیفہ مکتفی باللہ نے امام محمد بن جریر طبری سے ایک کتاب لکھوائی اور اس پر ان کو صلہ دینا چاہا تو انھوں نے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ لوگوں نے کہا ضرورت کے مطابق کچھ تو لے لیجئے۔ فرمایا میں امیر المومنین سے درخواست کروں گا کہ جمعہ کے دن سوال کرنے کی ممانعت کر دیں۔

بتلایئے کیا ایسے بے نیاز بے لوث، خوددار اور مخلص و دیانت شعار بزرگوں کی نسبت حدیثیں وضع کرنے یا احادیث ضعیفہ و موضوعہ کے قبول کرنے میں کسی قدر بھی جنبہ داری یا کسی کی رو رعایت کرنے کا شک اور شبہ کیا جا سکتا ہے؟ ہاں بدگمانی یا سفسطیانہ و فلسفیانہ شبہات کا علاج نہیں جن کی وجہ سے دنیا کی سب سے زیادہ یقینی چیز بھی غیر یقینی قرار پا سکتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ دنیوی اور دینی احکام و امور پر اس شک کا مطلقاً کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ایسے شکی لوگوں کی نسبت ہم اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

وما علینا الا البلاغ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

ایک خط اور اس کا جواب

آخر میں ہم اس خط کو مع اس کے جواب کے درج کرتے ہیں جو رسالہ برہان میں "فہم قرآن" کی تین قسطیں ملاحظہ فرمانے کے بعد ہمارے محترم دوست مولانا عبد المالک صاحب آروی نے لکھا تھا اور جس میں انھوں نے اپنے بعض ایسے شکوک و شبہات کا اظہار بے تکلفی کے ساتھ کردیا تھا جو غالباً اکثر انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل میں گذرتے ہوں گے۔

حضرت مولانا صاحب زادکرمہ۔ السلام علیک

آج "برہان" ملا۔ آپ نے "فہم قرآن" کے سلسلہ میں چودہ علوم کی معرفت لازم ٹھہرائی ہے، لغات، صرف و نحو اور تفسیر صحابہ (یعنی احادیث کی کتب تفسیر) کے علاوہ اور کون علوم ہیں؟ اور پھر سوال یہ ہوتا ہے کہ کسی فقیہ یا عالم دین کی اس آیت یا اجتہاد سے معارف قرآن اور نکات قرآن پر نقادانہ نظر ڈالنے کے لئے ان چودہ علوم کا جاننا لازم کیسے آسکتا ہے میں اس کو نہیں سمجھا ذرا تفصیل سے سمجھایئے۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ جب تک درس نظامی کی فرسودہ کتابوں پر سر نہ کھپایا جائے فہم قرآن تدبر فی القرآن کی منزل آہی نہیں سکتی۔ اب آپ ہی فرمایئے کہ اللہ میاں باوجود اس قدر رحم و کرم کے ایسا جبر کیونکر پسند فرمائیں گے، چودہ علوم؟ معاذ اللہ! گویا باضابطہ ایک شخص بی، اے پاس کرکے اگر لغات صرف و نحو اور احادیث کی مدد سے قرآن مجید کے دقائق و نکات سمجھنا چاہے تو گویا وہ اس سے بالکل محروم رہے گا کیونکہ اب اس کے پاس وقت تو ہے نہیں کہ آٹھ سال تک درس دینیات خود دہرا کر حصول خیر و برکت کرے۔ حالانکہ جہاں تک متن کے ترجمہ کا تعلق ہے اور اس سے استنباط مسائل کا، لا علمی

اور انگریزی زبانوں میں قرآن مجید کے متعلق ایسی ایسی کتابیں ملتی ہیں کہ عہد حاضر میں کسی ندوی یا (معاف کیجئے) دیوبندی کا وہاں تک گزر بھی نہیں ہو سکتا۔ اسی پر نیاز بگڑتے ہیں تو آپ چیں بجبیں ہوتے ہیں، بایں علم و فضل، روشن خیالی و وسعت مشرب، آپ پر بھی مولویوں کی "برہنیت" طاری ہو گئی۔ اور آپ نے دیبدل کی طرح تعلیمات قرآنی اور اس کے فہم و عرفان کو بھی اپنی جماعت تک محدود کر دیا۔

"خدا توفیق کیش کفر بخشد بر پناہاں را"

محب محترم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

والا نامہ آیا، آپ یقین کیجئے میں کسی کی تنقید سے ناراض نہیں ہوتا، چہ جائیکہ آپ ایسے مخلص دوست کی تنقید سے، جس کی نیت، جس کے خلوص و محبت پر مجھ کو اعتماد تام ہے، آپ اس سے بھی زیادہ سخت اور ترش لہجہ میں کہئے میں برا نہیں مانوں گا، مگر ہاں شرط یہ ہے کہ آپ کا خلوص جو میرے ساتھ ہے اس خلوص سے کم نہ ہونے پائے جو آپ کو حضرت نیاز سے ہے۔

جس چیز پر تنقید کی گئی ہے اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ اول تو آپ اس معنی کو پیش نظر رکھئے جو میں "فہم قرآن" سے مراد لیتا ہوں اور جس کو سامنے رکھ کر میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں۔ میرا مقصد جیسا کہ میں نے اس مضمون کے دوسرے نمبر میں تحریر کر دیا ہے فہم قرآن سے یہ ہے کہ کوئی شخص اس کو پڑھ کر مجتہدانہ طور پر استنباط احکام کر سکے اور کلام کے مدلول و منطوق کو کما حقہ سمجھ سکے، تو اب اس معنی کے پیش نظر سوال پیدا ہوتا ہے کہ استنباط احکام کا حق کس کو حاصل ہے اور کون مجتہدانہ طور پر قرآن کے فہم کا ادعا کر سکتا ہے۔ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں فہم قرآن کے اس معنی کو ملحوظ رکھ کر لکھ رہا ہوں ورنہ اگر آپ فہم قرآن سے احکام امر و نہی کو معلوم کرنا اور جو مضامین اس میں بیان کئے گئے ہیں ان کو سطحی طور پر جان لینا مراد لیتے ہیں تو میں آپ کی مخالفت نہیں کروں گا اور اس اعتبار سے بے شبہ فہم قرآن کے لئے شرائط وہ نہیں ہیں جو میں لکھ رہا ہوں۔

جہاں تک اس مسئلہ کی اصل حقیقت کا تعلق ہے وہ اس قدر واضح ہے کہ کسی بحث و نظر کی ضرورت ہی نہیں۔ دیوان غالب کو دہلی اور لکھنؤ کے لوگ جس طرح پڑھتے ہیں ایک پشاوری بھی اس سے اتنا ہی مزہ لیتا ہے لیکن کیا اس پر تنقید کا حق ہر ایک کو حاصل ہے؟ کیا اس پر نقد کرنے کے لئے اردو زبان کے مالہٗ وما علیہ، اس کے محاورات وطرقِ استعمال، قواعد، فصاحت و بلاغت کے آئین وضوابط، ذوقِ شعری، فلسفہ وغیرہ وغیرہ ان چیزوں کے نہ صرف جاننے بلکہ ان میں ایک نظرِ وسیع پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ غالب کا یہ شعر۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

اس کا تھوڑا بہت مطلب ہر اردو خواں اور کالج کا ہر ایک گریجویٹ سمجھ سکتا ہے لیکن کیا اس کی شرح کا حق ہر ایک کو ایسا ہی ہے جیسا کہ عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم، عبدالمالک آروی، نیاز فتحپوری اور حسرت موہانی کو ہے؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو پھر آپ کلام مجید کے متعلق اس حیثیت سے نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، بلکہ اس حیثیت سے بھی کہ وہ ایک متکلم کا کلام ہے کس طرح یہ فرما سکتے ہیں کہ اس کے مدلول ومنطوق کو سمجھنے کے لئے عربی کی معمولی شدبد کافی ہے، اس ادعا سے آپ کے خیال واستنتاج کے برعکس ویدوں کی طرح قرآن مجید کا اسلامی برہمنوں کے ساتھ مخصوص ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ ہمارے ادعاء کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کو مجتہدانہ طور پر سمجھنے کے لئے چند شرائط ہیں بیشک ایسے ہی جیسے ہر آسان سے آسان علم وفن میں کمال پیدا کرنے کے لئے چند شرائط ہوتے ہیں۔ ہر شخص جو ان شرائط کو پورا کر سکے گا فہم قرآن کا مدعی ہو سکتا ہے۔ اس میں ذات پات مقام ونسب وغیرہ کسی کی کوئی قید نہیں۔ جس طرح طب آسان ہے مگر اس کے لئے قانون شیخ وغیرہ کا مطالعہ ضروری ہے ہر شخص ڈاکٹر، وکیل اور پروفیسر ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس نے ایم بی بی ایس، ایل ایل بی، یا ایم اے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کر رکھی ہوں۔ اسی طرح ہم کہتے ہیں قرآن آسان ہے۔ ہر شخص کو اس کا

تدبر اور تفکر کرنا چاہیے مگر اس کے لئے چند شرائط ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس ادعا سے میری برہمنیت کس طرح لازم آجاتی ہے۔

اب رہا چودہ علوم کی شرط کا معاملہ تو یہ واضح رہنا چاہیے کہ یہ چودہ علوم براہ راست فہم قرآن کے لئے ضروری نہیں، بلکہ علماء ادب و بلاغت کے نزدیک کوئی شخص عربی نظم و نثر کو بخوبی سمجھ نہیں سکتا جب تک وہ ان علوم میں دسترس نہ رکھتا ہو اور فہم قرآن کے لئے اولین ضرورت عربی کلام کو کما حقہ سمجھنے کی صلاحیت ہے اس بنا پر لازم یہ آگیا کہ فہم قرآن عجمیوں کے لئے ان علوم کے بغیر دشوار ہے یہ کس نے کہا کہ ندوہ یا دیوبند میں ہی ان علوم کی تحصیل کیجئے بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ ان علوم کی بھی ضرورت نہیں اگر آپ کسی اور طریقے سے کلام عربی کو سمجھنے کی استعداد رکھتے ہیں تو سبحان اللہ! پھر احمق ہے جو آپ سے کہے کہ ان علوم کو حاصل کیجئے۔

میں اگر ان علوم ادب کے بغیر امراء القیس، اعشیٰ، طرفہ کے عربی کلاموں کو ان کی فصاحت و بلاغت کے ادراک و شعور کے ساتھ سمجھ نہیں سکتا تو ظاہر ہے ان کے بغیر قرآن مجید کو جو عربی زبان کی انتہائی فصیح و بلیغ کتاب ہے کس طرح سمجھ سکتا ہوں۔ پس ہر وہ شخص جو آج فہم قرآن کا مدعی ہے اس سے دریافت کیجئے کیا وہ شعر عرب کو جانتا ہے؟ کیا وہ عربی شعراء کے کلام کو بے تکلف سمجھ سکتا اور ان کے نکات و لطائف کو معلوم کر سکتا ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو اسے کیا حق ہے کہ وہ محض ترجمہ کی مدد سے قرآنی آیات کی تشریح و توضیح شروع کر دے۔ اقبال کی رموز بیخودی کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ لیکن بتائیے کیا ایک انگریزی ترجمہ کے ذریعہ اقبال کو جاننے والا اقبال کے کلام سے اتنا ہی محظوظ ہو سکتا ہے جتنا ایک ایرانی یا فارسی کا کوئی خوش مذاق شخص!

آپ نے مجھ کو مولویانہ "برہمنیت" کا طعنہ دیا ہے۔ حالانکہ میرا مقصد بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ میں "ہر بوالہوس کی حسن پرستی" گوارا نہیں کر سکتا، ہاں "شیوۂ اہل نظر" رکھنے والے شوق سے آئیں اور قرآن کے حسن جہاں آرا کے جلووں سے بہرہ اندوز ہوں۔ میں حسن کو صرف ایک تفریحی نظر بازی کی چیز نہیں سمجھتا بلکہ میں اس کی بارگاہ میں سودائے عشق سے بھرے ہوئے سروں کو

ختم دیکھنا چاہتا ہوں۔

آپ نے یہ بجا لکھا ہے کہ غریب مُلّاؤں اور دیوبندیوں کو تو اُن کتابوں کی ہوا بھی نہیں لگی جو لاطینی اور انگریزی زبانوں میں قرآن مجید کے متعلق موجود ہیں، لیکن سوال صرف یہ ہے کہ اس سے نقص کیا لازم آیا؟ زیادہ سے زیادہ یہی کہ ایک غیر زباندان نے جو تفسیر کی تھی وہ معلوم نہیں ہو سکی، لیکن اگر ایک شخص عربی نہیں جانتا تو آپ جانتے ہیں، وہ قرآن فہمی کے اعتبار سے کس قدر گھاٹے میں ہے وہ اس زبان کو نہیں جانتا جس میں قرآن نازل ہوا۔ اس کے اقوال و افعال سے بے خبر ہے جس پر قرآن اترا، اس ماحول سے ناآشنا ہے جس میں قرآن کا تعامل ہوا۔ اور ان چیزوں کے متعلق اگر اس کے پاس چند معلومات ہیں بھی تو ان لوگوں کی دی ہوئی جن کو "اجنبی" یا "مرد بیرون خانہ" کہا جا سکتا ہے۔ اب فرمائیے نقصان عظیم میں کون ہے؟ پہلا شخص یا دوسرا؟ بھائی اس دور میں سب سے بڑی مصیبت تو یہی ہے کہ ہم قرآن کی تفسیر بھی ابن عباسؓ اور ابن عمرؓ کے بجائے انگریزوں کی زبان سے سننا چاہتے ہیں، کہئے کیا آپ کی غیرت گوارا کریگی کہ آپ اردو کے ایک شعر کا مطلب داغ و امیر کے بجائے کسی انگریز سے دریافت کریں۔ دراں حالیکہ وہ اردو کے ذوق شعری سے ناآشنائے محض ہو۔

آپ تحریر فرماتے ہیں کہ "آپ کی شرط کے مطابق ایک شخص جو بی اے ہے اور تدبر فی القرآن کرنا چاہتا ہے اگر اس سے یہ کہدیا جائے کہ تم پہلے چودہ علوم حاصل کرو تب اس قابل ہو سکتے ہو تو اس سے زبر جبر لازم آئے گا اور اللہ تعالیٰ اس قدر فضل و کرم کے باوجود کس طرح یہ جبر گوارا کرے گا" میں کہتا ہوں کہ اگر ہر شخص طبیب نہیں ہو سکتا تو کیا وہ اپنے امراض کے علاج کے لئے کسی طبیب حاذق پر اعتماد نہ کرے، آپ کی تحریر سے تو یہ لازم آتا ہے کہ ہر شخص جسے اپنے کسی مرض کے علاج کی ضرورت ہو اُسے طب حاصل کرنی چاہیئے۔ ہر شخص جو عدالت میں کوئی مقدمہ لڑنا چاہتا ہے اس کو بیرسٹری کا ڈپلومہ لینا چاہیئے، جس شخص کو مکان بنانے کی ضرورت ہو اس کو انجینیری کی تعلیم حاصل کرنی ضروری ہے اور اسی طرح جو شخص قرآن مجید میں تدبر کرنا چاہتا ہے

وہ تمام مشاغل دنیویہ کے ہوتے ہوئے بھی قرآن کو مجتہدانہ طور پر سمجھ سکتا ہے۔ پس ہر شخص کو اجتہادی طور پر "تدبر فی القرآن" کی دعوت دینا یہ جبر ہے، یا یہ کہ تقسیم عمل کے اصول پر کام کیا جائے اور ہم جس طرح دنیوی معاملات میں ڈاکٹروں، بیرسٹروں، پروفیسروں اور انجینیروں کی جماعت پر اعتماد کرتے ہیں اسی طرح دینی و مذہبی معاملات میں بھی ایک جماعت ہو جس پر ہم اعتماد کلی کریں اور ہر ایک شخص سے یوں نہ کہیں کہ اس کو خود اس جماعت (علماء دین) سے بے پروا ہو کر اپنی رائے اور عقل کے مطابق تفسیر کرنی چاہیے۔ آپ شوق سے "تدبر فی القرآن" کیجئے خدا آپ کے عزائم میں برکت اور حوصلوں میں وسعت عطا فرمائے لیکن اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو اس کو محض اس بنا پر کہ وہ آپ کی سمجھ میں نہیں آتی ہے اور اگرچہ اس کو بڑے بڑے ائمہ کرام نے لکھا ہے رد نہ کیجئے۔